Regd. L. No. 7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر 1969

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء

شہدائے پاکستان

اس انتظار میں ہیں کہ ہم ان کے خون کی

قیمت کب ادا کرتے ہیں۔

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک

سالانہ	پاکستان	دس روپے
سالانہ	ہندوستان	پندرہ روپے
سالانہ	غیر ممالک	ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاکستان ــــ ایک روپیہ

ہندوستان

ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم۔ ادارہ طلوعِ اسلام

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

جلد (۲۲) | ستمبر ۱۹۶۹ء | نمبر (۹)

فہرست

۱۔ لمعات ــــــــ ۲

۲۔ عالمِ افلاک۔ قرآن کی روشنی میں ــــــــ ۱۷

۳۔ معراجِ نبوی ــــــــ ۳۱

۴۔ اسلام کیا ہے؟ ــــــــ ۳۸

۵۔ مجموعہ قوانین اسلام جلد دوم پر ایک اجمالی نظر (شاہد عادل) ــــــــ ۴۹

۶۔ حقائق و عبر ــــــــ ۶۹

۷۔ ترکی کا عالمی کردار (محترم خورشید عالم) ــــــــ ۷۳

ایڈیٹر۔ محمد خلیل۔ ناشر۔ سراج الحق۔ مقام اشاعت۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲۔ لاہور۔ پرنٹر۔ شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس ایبٹ روڈ لاہور

یاد میں

(۱) پاکستان کی سرحدوں پر بسنے والے ان بے گناہ، مظلوم انسانوں کی جنہیں بھارتی درندوں نے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح بغیر کسی قسم کی آگہی یا اعلانِ جنگ کے اُس وقت اپنی ہوسِ خون آشامی کا شکار بنایا جب وہ آرام سے اپنے گھروں میں سو رہے تھے اور ستاروں کی آنکھوں کے علاوہ اس خونی منظر کا دیکھنے والا بھی کوئی نہ تھا۔

(۲) اُن معصوم بچوں کی جنہیں مرہٹہ "بلوانوں" اور سکھ "سورماؤں" نے اُچھال اچھال کر اپنی سنگینوں کی نوکوں سے چھلنی کر دیا۔ اس جرم کی پاداش میں کہ انہوں نے مسلمانوں کے گھروں میں جنم کیوں لیا تھا۔

(۳) اُن عزت مآب دخترانِ ملت کی جنہیں یہ انسان نما بھیڑیئے، ان کے صحنِ خانہ سے ان نامعلوم ویرانوں کی طرف کشاں کشاں لے گئے جہاں سے پھر ان کی آہ و فغاں تک کسی کو سنائی نہ دی۔

(۴) اور ـــ یاد میں

اُن غیور و جسور جوانانِ ملت کی جو ان بے پناہ مظالم کا بدلہ لینے کیلئے شمشیر بکف اور کفن بدوش میدانِ کارزار میں آنکلے اور اپنی عدیم النظیر جرأت و بسالت سے دنیا کو دکھا دیا کہ حق کی خاطر جان دینے والے کیا کچھ کر دکھایا کرتے ہیں۔

اور ـــ چھمب، جوڑیاں، سیالکوٹ، چونڈہ، واہگہ، برکی، ہڈیارہ، سلیمانکی، راجستھان کے میدانوں کے ان ذرات کی جو اپنی عالمتاب چمک دمک سے اس حقیقت کی شہادت دیتے ہیں کہ خونِ شہدا کی رنگینی کس طرح حنا بندِ عروسِ ملت ہوتی ہے۔

لاکھوں سلام و صلوٰۃ ہوں اُن شہدائے امت اور مجاہدینِ ملت پر جنہوں نے اپنی فقید المثال قربانیوں سے اس خطۂ زمین کو دشمن کی دستبرد سے محفوظ رکھا۔ جسے اسلام کی تجربہ گاہ بننے کیلئے حاصل کیا گیا تھا۔ ؎

سرِ خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لمعات

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی!

قرآنِ کریم کے پہلے پارہ میں چند اوراق الٹنے کے بعد تاریخ کے ایک عظیم انقلاب انگیز واقعہ کا تذکرہ سامنے آتا ہے جس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ۔ (۲/۴۷)۔ اے قوم بنی اسرائیل! تم میری اس نعمت کو یاد کرو جس سے تمہیں نوازا گیا تھا۔ یہ نعمتِ عظمیٰ کیا تھی جس کی انہیں صدیوں کے بعد بھی یاد دہانی کرائی جاتی ہے؟ یہ نعمت تھی —— وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ (۲/۴۹) جب ہم نے تمہیں قومِ فرعون کے دستِ تظلم سے نجات دلائی تھی۔ اس سے واضح ہے کہ کسی کمزور قوم کا، قومِ غالب کے شکنجہ استبداد سے رہائی پاجانا، خدا کی ایسی عظیم القدر نعمت ہے جس کی یاد کو اس قوم کی تاریخ میں محفوظ رہنا چاہیئے۔ یہ نعمت کیسی عظیم اور اس کی یاد کا تازہ رکھنا کس قدر اہم ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب نبی اکرمؐ ہجرت کے بعد مدینہ تشریف لے گئے تو آپ نے دیکھا کہ وہاں یہودی عاشورۂ محرم کا روزہ رکھتے ہیں۔ دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ ہمیں اس دن فرعون کی غلامی سے نجات ملی تھی اس لئے ہم اس کی یاد میں جشنِ مسرت مناتے ہیں اور بطورِ شکرانِ نعمت اس دن روزہ رکھتے ہیں۔ آپؐ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا کہ تم بھی اس دن کا روزہ رکھا کرو کیونکہ اس نعمتِ خداوندی کا تعلق صرف بنی اسرائیل سے نہیں۔ یہ واقعہ ہر اس قوم کے لئے وجہِ سپاس گذاری ہے، جو کمزور قوموں کو مستبد اقوام کے حلقۂ غلامی سے آزاد کرانے کا داعیہ رکھتی ہو۔ قرآنِ کریم نے اقامتِ دین (اسلامی نظام کے قیام) کو بڑا صبر آزما اور ہمت طلب مرحلہ قرار دیا ہے —— اور اسی جہت سے اسے پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنے سے تشبیہ دی ہے۔ اقامتِ دین کا یہ صبر آزما مرحلہ کیا ہے؟ فَکُّ رَقَبَۃٍ (۹۰/۱۳) غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی گردن کو آزاد کرنا۔ اور حضور نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد ان الفاظ میں بیان کیا گیا کہ ——

وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ط (۷/۱۵۷) وہ ان زنجیروں کو توڑ دیگا جن میں نوعِ انسانی جکڑی ہوتی ہے اور اس کے سر سے ان بوجھل سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے نیچے وہ کچلی جا رہی ہے۔ چنانچہ حضور نبی اکرمؐ نے اپنی عدیم النظیر تعلیم اور فقید المثال عمل سے عالمگیر انسانیت کو، ہر نوع کی غلامی سے آزاد کرایا اور اس طرح اپنے آپ کو رحمتہ للعالمین کا مجسمہ بنا کر دکھا دیا۔ علیہ التحیۃ والسلام —!

لیکن پھر، گردشِ ایام سے —— کہ جو انسانوں کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت ہی کا دوسرا نام ہے —— ہوا یہ کہ وہی قوم جس نے دنیا کی غلام قوموں کو آزادی کی نعمت سے نوازا تھا، خود دوسروں کی غلام ہو گئی۔ اس غلامی کی بدترین مثال ہم ہندی مسلمانوں کا ہندو جیسی غلام ابن غلام قوم کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے جانا تھا۔ لیکن یہ نوازشاتِ خداوندی میں سے تھا کہ اس ژولیدہ بخت قوم میں سرسیدؒ، اقبالؒ، اور جناحؒ جیسی شخصیتیں پیدا ہو گئیں جنہوں نے اپنی مومنانہ فراست اور مدبرانہ بصیرت سے غلامی کی ان زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور ۱۴ اگست کی سہانی صبح کو یہ قوم، ایک آزاد مملکت کی مالک بن گئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک حمداً کثیراً۔

لیکن جب محکوم قوم، مستبد قوم کے دستِ تظلم سے رہائی حاصل کرتی ہے تو ہر چند وہ اس قوم کی گرہ سے کچھ لے کر نہیں نکلتی، وہ (مستبد) قوم اسے گوارا ہی نہیں کر سکتی کہ اس کا شکار اس کے دانتوں کی گرفت سے یونہی نکل جائے۔ حاکم قوم کو اپنے جذبۂ تحکم کی تسکین کے لئے محکوم قوم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر قومِ محکوم اس کی گرفت سے نکل جائے تو وہ حکومت کس پر کرے۔ یہ وجہ ہے کہ اس قسم کی انسانیت کُش قومیں، محکوم قوموں کی حصولِ آزادی کی کوششوں کو کچلنے اور ان کی آزادی کو سلب کرنے کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کرتی ہیں۔

ہماری موجودہ (خوش بخت) نسل، جس نے پاکستان کی آزاد سرزمین میں آنکھ کھولی ہے، اس کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتی کہ ہندو کیا ہے اور اس کی محکومی کے معنی کیا تھے۔ اس کی خفیف سی جھلک دیکھنے کے لئے صرف ایک واقعہ کو سامنے لائیے۔ ۱۹۳۷ء-۳۹ کا ذکر ہے کہ (ہندوستان کی) کانگریس نے .... حکومت میں شمولیت کا فیصلہ کیا —— اس سلسلہ میں دو ایک باتیں پیشِ نظر رکھئے۔ اس زمانے میں ملک میں ہنوز انگریزوں کی حکومت تھی، اور اہل ہند کی اس حکومت میں شرکت، انگریز کے زیرِ سایہ اور اس کی عائد کردہ حدود و قیود کے تابع ہو سکتی تھی۔ دوسرے یہ کہ کانگریس اپنے آپ کو ہندوؤں کی جماعت نہیں کہتی تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل (متحدہ قومیت) کی نمائندہ قرار دیتی تھی۔ ان حالات میں انہوں نے جس

طرح حکومت کی اور اس حکومت میں مسلمانوں پر جس طرح عرصۂ حیات تنگ ہوا، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ سال ڈیڑھ سال کے بعد جب انہوں نے حکومت کی کرسیاں خالی کیں، تو قائدِ اعظمؒ نے مسلمانانِ ہند سے کہا کہ وہ اس تقریب پر "یومِ نجات" منائیں۔ ابھی یومِ نجات منایا نہیں گیا تھا، صرف اس کی تجویز قوم کے سامنے رکھی گئی تھی، کہ ہندوؤں نے اس پر وہ شور مچایا، ایسی قیامت برپا کی، گویا ملک پر کوئی بہت بڑی تباہی آنے والی ہے۔ وہ جو کہا کرتے ہیں کہ "زدرا اور ہمارے اور رونے بھی نہ دے" اس کا صحیح منظر سامنے آرہا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ ہماری موجودہ نسل کہیں اس وقت موجود ہوتی تو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتی کہ ہندو ہمارے ساتھ کرتا کیا تھا؟ ایسا تو ممکن نہ تھا ــــ نہ ہی ہم اُس منظر کو بجنسہٖ اِس وقت ان کے سامنے لا سکتے ہیں۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے اُس وقت اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا تھا اُسے اپنی قوم کے نوجوانوں کے سامنے پیش کر دیں۔ اس سے وہ تھوڑا بہت اندازہ لگا سکیں گے کہ ہماری اُس وقت حالت کیا تھی ــــ طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت جنوری سنہ ۱۹۴۰ء میں،

یومِ نجات

کے عنوان سے ہم نے لکھا تھا۔

"صدر مسلم لیگ نے ہندوستان میں "یومِ نجات" منانے کا اعلان کیا کیا گویا بھڑوں کے چھتہ میں پتھر دے مارا۔ پریس، جس کی قوت سے آج کی دنیا میں کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، ہندوؤں کا اپنا ہے۔ اس لئے جا و بیجا شور مچانے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ ملک کے طول و عرض میں طوفان برپا کر دیا گیا۔ قریہ بہ قریہ اور دہ بہ دہ ایک آگ لگا دی گئی۔ کانگرسی۔ مہاسبھائی۔ سرمایہ دار۔ سوشلسٹ۔ چھوٹے۔ بڑے۔ کس و ناکس۔ ہر ایک نے چلانا شروع کر دیا اور وہ ہلڑ مچا یا کہ توبہ بھلی۔ اور یہ سب کچھ کس بات پر؟ صرف اس جُرم پر کہ مسلمان اُن زخموں پر سے کپڑا کیوں اٹھاتے ہیں جو انہیں اِن "برادرانِ یوسف" کے ہاتھوں گزشتہ دو تین برس میں لگے۔ وہ اس گھاؤ کی تکلیف سے کراہتے کیوں ہیں جو ان کم ظرف تازہ واردانِ بساطِ حکومت کی ہوسِ ستم رانی، اور مشقِ ناوک فگنی کے صدقے اُن کے کلیجے میں ناسور ڈالے ہوئے ہے۔ ان پر الزام یہ ہے کہ انکے سینے میں ایسا دل کیوں ہے جسے جور و استبداد کا احساس ہو۔ ان کی آنکھیں کیوں ایسی حساس ہیں کہ ان میں دفورِ غم سے آنسو ڈبڈبا آئیں۔ ہندوؤں کو شکایت ہے کہ ہم مسلمانوں کو مارتے ہیں تو یہ روتے کیوں ہیں۔ ہم انہیں ذبح کرتے ہیں تو ان کی رگوں سے ایسا رنگین خون کیوں نکلتا ہے جو ہمارے دامنِ معصومیت کو داغدار بنا دے۔ انہیں گلہ ہے کہ ہم ان کا گلا گھونٹتے ہیں تو یہ

سامنے سے آنکھیں کیوں دکھاتے ہیں۔ انہیں شکوہ ہے کہ ہم اُن کی متاعِ تہذیب و تمدن اور سرمایۂ علم و دین کو لوٹتے ہیں تو یہ ہمیں بلندیٔ اقبال اور علوِ مرتبت کی دعائیں کیوں نہیں دیتے۔ انہیں افسوس ہے کہ یہ "بد ذوق" ہماری شمشیرِ جوہر دار کی روانی پر تحسین و آفرین کے نعرے بلند کیوں نہیں کرتے۔ انہیں رنج ہے کہ یہ بسمل قاتل کو مرحبا کہنے کی بجائے تہِ خنجر تڑپتے کیوں ہیں۔ اُن کی پیشانی شکن آلود ہے کہ جب ہم تیغ بکف ان کی طرف ہجوم کر کے آتے ہیں تو ان ناآشنایانِ آئینِ محبت کی طرف سے ہمارا استقبال ان الفاظ میں کیوں نہیں ہوتا کہ ؎

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

اور انہیں بے حد قلق ہے کہ جب ہم تیر چلّہ پر چڑھا کر ان کے سینے کو چھلنی کرنا چاہتے ہیں تو یہ ناواقفانِ دستورِ عشق یہ کیوں نہیں کہتے کہ

تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

ہاں! انہیں گلہ ہے اور بجا طور پر گلہ۔ انہیں صدمہ ہے اور بالکل برمحل صدمہ کہ یہ "بندگانِ وفا" اپنے اللہ کے حضور ہمارے ظلم و ستم کی فریاد لے کر کیوں پہنچتے ہیں۔ اور حق تو یوں ہے کہ ایک ہندو ہی پر کیا موقوف ہے، دنیا میں کون سا ظالم ہے جو اپنے آپ کو ظالم کہلا کر خوش ہوتا ہے۔ کونسا ستمگر ہے جو اپنے ستم و استبداد کے چرچے سنکر فعلِ در آتش نہیں ہو جاتا۔ فرعون کو بھی حضرت موسیٰؑ سے یہی شکایت تھی کہ وہ بنی اسرائیل کو "شکرِ نعمت" کے بجائے "شکوۂ جور و ستم" کا سبق دیتے تھے۔ جب سے دنیا میں ظلم و ناانصافی کا وجود قائم ہوا ہے، ظالم کو ہمیشہ یہ گلہ رہا ہے کہ مظلوم اس کے ظلم و استبداد کی شکایت کیوں کرتا ہے۔ لہٰذا آج ہندو مسلمانوں کے احساسِ مظلومیت کے مظاہرہ کے خلاف اگر اس قدر آتش در پیرہن ہے تو یہ کون سی نئی بات ہے ؎

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری "

یہ تھا وہ ہندو جس کے پنجۂ استبداد سے رستگاری کے بعد ہم نے اپنی آزاد مملکت قائم کی۔ ہمارے نقطۂ نگاہ سے تو اس سے معاملہ ختم ہو گیا تھا لیکن ہندو کی ہوسِ خون آشامی ایسا تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ جب حضرت موسیٰؑ کو مظلوم بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر نکل جانے کا حکمِ خداوندی ہوا تھا تو آپ کو بتا دیا گیا تھا کہ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ۔ (۲۶/۵۲) یاد رکھو! تم یہاں سے نکل جانا چاہو گے تو قوم فرعون تمہیں اطمینان سے ایسا نہیں کرنے دیگی۔ وہ تمہارا پیچھا کرے گی ـــ چنانچہ اس نے پیچھا کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس

سے اس کا اپنا حشر کیا ہوا۔

اسی طرح جب نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم (اور جماعت مومنین) مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے گئے تو قریش نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور ایک جمِ غفیر لے کر، بدر کے میدان تک جا پہنچے — اور وہاں ان کا حشر بھی وہی ہوا جو آلِ فرعون کا ہوا تھا۔

اور اسی طرح، جب ہم ہندوؤں سے الگ ہو کر، اپنی آزاد مملکت کی طرف آ گئے، تو انہوں نے بھی ہمارا پیچھا نہ چھوڑا۔ انہوں نے ہمارے خلاف یورش کرنے کا نہیں تو دسمبر ۱۹۴۷ء ہی میں کر لیا تھا لیکن حالات نے انہیں اس کی اجازت نہ دی۔ چنانچہ وہ اندر ہی اندر بس بھی گھولتے رہے اور پاکستان کو (نصیب دشمناں) ختم کرنے کی تیاریاں بھی کرتے رہے۔ اور جب ان کے سورماؤں نے انہیں یقین دلا دیا کہ وہ صبح کو امرتسر سے چل کر، سورج غروب ہونے سے پہلے .....، لاہور کے جم خانہ میں جشنِ فتح منا لینگے، تو وہ اپنی پوری قوتوں کو مجتمع کرکے، ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح، لاہور کی دہلیز پر آ دھمکے۔ ان کی یہ یورش، لاہور کی دہلیز تک محدود نہیں تھی، انہوں نے سولہ سو میل کے پورے محاذ پر اپنی فوجوں کو پھیلا دیا تھا۔

یہ اہتمام تھے، اور ایک مشت پر کے لئے!

آج ہم، اسی لاہور شہر میں واقعہ ایک مکان میں بیٹھے، نہایت اطمینان اور سکون سے یہ سطور لکھ رہے ہیں، اور آپ اسی پاکستان کے مختلف گوشوں میں بیٹھے اسی اطمینان اور سکون سے انہیں پڑھ رہے ہیں۔ لیکن ذرا، اپنے حافظہ کو چار سال پیچھے لے جایئے اور سوچئے کہ اس وقت ہماری حالت کیا تھی؟ ہم اہل لاہور (اور اہل سیالکوٹ وغیرہ) کی کیفیت یہ تھی کہ اُن وحشی درندوں کے للکاروں کی آواز تک ہمارے کانوں میں آ رہی تھی — آواز کانوں میں آ رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ انسانوں کی آواز نہیں، اس بجلی کی کڑک ہے جو ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کی عزیز سے عزیز تر متاع پر آتشِ سوزاں بن کر گرنے اور اسے آنِ واحد میں خاکستر بنا دینے والی ہے۔ یہ احساس ہر سانس کے ساتھ ابھرتا اور نشتر بن کر رگِ جان میں ڈوب جاتا تھا۔ فضا میں ہر طرف مایوسیاں پھیل رہی تھیں، ہر دیدۂ بینا اس تصور سے تھرا رہا تھا کہ آج کی صبح خنداں کا انجام شامِ غریباں نہ ہو جائے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا ہوگا اور ہم کیا کریں۔ خوف و ہراس کے اس جنگل عالم میں، ہماری عزت و ناموس کی پیکر، معصوم بچیاں، ڈری، سہمی ہوئی، ہماری طرف تکتی تھیں۔ ہم بظاہر انہیں تسلیاں دیتے تھے لیکن اندر سے دل ڈوبا جا رہا تھا۔

لیکن قوم کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک نہ رہی۔ دوپہر کے ریڈیو نے فضا کو متحرک کیا تو قوم کی نگاہوں کے سامنے ایک نئی دنیا بیدار ہو گئی۔ اس کے دل میں تازہ ولولوں نے انگڑائیاں لیں۔ اس کی رگوں

میں خونِ زندگی بجلی بن کر دوڑ گیا۔ اس کی مایوسیاں امیدوں میں اور اس کا خوف و ہراس ہمت اور حوصلوں میں بدل گیا ۔۔۔ جیوشِ مملکت کے جیالے نوجوان کوہ آسا عزم کے ساتھ اُٹھے اور دشمن کے سیلابِ بلا کے سامنے آہنی دیواریں کر کھڑے ہو گئے۔ اب ہم حصارِ عافیت میں تھے اور ہمارے سروں پر ہماری فضائی فوج کے عقابوں کے سائے "سقفِ محفوظ" بن کر منڈلا رہے تھے۔ سترہ دن تک یہ بنیانِ مرصوص (یہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار) اپنے عزمِ راسخ اور یقینِ محکم کے سہارے چٹان کی طرح کھڑی رہی اور دشمن کی تعداد کی کثرت اور اسلحہ کی برتری اس میں کہیں، کسی جگہ، ذرا شگاف بھی پیدا نہ کر سکی۔ اور سترہ ہی دن تک ہمارے سروں کے اوپر اقبال کے "شاہین بچے" ۔۔۔ اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے ۔۔۔ کا تحیر انگیز منظر پیش کر کے موت کی ہنسی اڑاتے رہے۔ دوسری طرف، اس مورِ ناتواں کے برگِ گل کے سفینے، دوارکا تک کے بیڑوں کو، قومِ فرعون کی طرح، غرقِ آب شور کر کے، ہنستے مسکراتے، اپنی گودیوں میں آتے جاتے رہے۔ ان سترہ دنوں نے بتایا کہ ملّتِ بیضا کے برسے ہوئے بادلوں میں اب تک بھی کتنی بجلیاں خوابیدہ اور اس کی خاکستر میں کتنے حشر بداماں شعلے آسودہ ہیں۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اس حملہ میں بھارت کی توجہات کا اولین اور بنیادی مرکز لاہور تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے اپنی بیشتر قوتوں کو اسی ایک نقطہ پر مجتمع کر دیا تھا۔ ہم نے یہاں "نقطہ" کا لفظ تمثیلاً نہیں لکھا، ایک حقیقت کے اظہار کے لئے لکھا ہے۔ واہگہ سرحد عبور کرنے کے بعد دشمن کے سیلابِ بے پناہ اور لاہور کے درمیان ایک چھوٹی سی نہر (بی۔ آر۔ بی) اور اس نہر پر ایک چھوٹا سا پل حائل تھا۔ یہ وہ پل ہے جس کے ایک طرف (جانب لاہور) باٹا کی فیکٹری تھی اور دوسری طرف (واہگہ کی جانب) ایک چھوٹا سا گاؤں جسے ڈوگرائی کہا جاتا ہے۔ سترہ دن تک بھارتی سیناؤں (فوجوں) کا مرکز یہی چھوٹا سا گاؤں اور اس کے اردگرد کا میدان تھا ۔۔ نقشہ پر دیکھئے تو یہ گاؤں ایک نقطہ سے زیادہ وسیع و عریض دکھائی نہیں دے گا۔ اسی ایک نقطہ پر اولاً لاہور اور اس کے بعد مغربی پاکستان کے عدم اور وجود کا دار و مدار تھا۔ جنگ کے دوران اور اس کے بعد ہندوؤں کی حکومت نے معرکۂ ڈوگرائی میں بھارتی افواج کی کامیابیوں اور اس کے سورماؤں کی معرکہ آرائیوں کے جو ڈھول پیٹے تھے، ان کی آواز سے بین الاقوامی فضا تک گونج اٹھی تھی۔ ہم اہلِ پاکستان کے لئے اس ڈھول کے پول کے لئے اس سے زیادہ ٹھوس شہادت کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ اُن کی اِن تمام مشہور کردہ کامرانیوں اور معرکہ آرائیوں کے باوجود سترہ دنوں میں ان کا ایک قدم بھی نہر کے اس پار نہ پہنچ سکا۔ لیکن باہر کی دنیا والوں پر اس کا پول ۲۱ اپریل ۱۹۶۹ء کو اس انداز سے کھلا کہ وہ اہلِ بھارت کو مخاطب کر کے بیک زبان پکار اُٹھے کہ

شرم تم کو مگر نہیں آتی!

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بھارت میں ایک ممتاز اینگلو انڈین ہیں ـــــ مسٹر فرینک انتھونی ـــــ بیرسٹر بھارتی پارلیمنٹ کے ممبر اور وہاں کی دفاعی کونسل کے رکن ـــــ بھارتی حکومت باہر کی دنیا کے سامنے جن فوجی افسروں کی بہادری کے کارنامے فخر و مباہات سے بیان کرتی تھی، دروں پردہ انہیں ان کی بزدلی اور پسپائی کے جرم میں سزائیں دے رہی تھی۔ ان افسروں کی فریاد مسٹر انتھونی کے کانوں تک بھی پہنچی تو انہوں نے جنگ ستمبر کی اعوانت اور دیگر کوائف کے متعلق وہاں کے خفیہ ریکارڈ کی چھان بین شروع کر دی۔ وہ جوں جوں ان دستاویزات کا مطالعہ کرتے تھے، ان پر عجیب و غریب راز منکشف ہوتے چلے جاتے تھے۔ چنانچہ اس تحقیق و تفتیش کی بنا پر انہوں نے ایک رپورٹ مرتب کی۔ ۱۲ اپریل ۱۹۶۹ء کا ذکر ہے کہ بھارت کی پارلیمان (لوک سبھا) میں وزارتِ دفاع کی طرف سے کوئی رپورٹ زیر بحث تھی۔ جب محفل میں کچھ گرمی پیدا ہوئی اور حکومت کیطرف سے (حسبِ معمول) غلط بیانیوں کے پلندے سامنے آنے شروع ہوئے تو مسٹر انتھونی خاموشی سے اپنی نشست سے اٹھے اور اپنی رپورٹ میں درج شدہ خفیہ کوائف کو بھری مجلس میں کھول کر سامنے رکھ دیا۔ اس میں انہوں نے کہا کہ

> میں نے اپنی سرکاری اور پیشہ ورانہ حیثیت میں جنگ ستمبر کے ریکارڈ اور اعداد و شمار کا تحقیقی جائزہ لیا ہے جس سے کچھ ایسے حقائق سامنے آتے ہیں جو ہماری حکومت نے عوام اور ساری دنیا سے چھپا رکھے تھے۔

ان حقائق سے منکشف ہوا کہ لاہور کی اس دہلیز پر بھارتی فوج کے دس ہزار سپاہی اور چار سو افسر ہلاک ہوئے تھے اور پاکستانی مجاہدین کے ہاتھوں پٹنے کے جرم کی پاداش میں، تین جرنیلوں، دس بریگیڈیئروں اور پچیس کرنیلوں کا کورٹ مارشل کیا گیا۔ بعض کو فوج سے برطرف کر دیا گیا اور بعض کو نااہل اور بزدل قرار دے کر قبل از وقت پنشن پر بھیج دیا گیا۔ ان میں ایک جرنیل، پانچ بریگیڈیئر اور زیادہ تر کرنیل اسی واہگہ محاذ کے تھے۔ مسٹر انتھونی نے اس کور کے متعلق جسے ۸ ستمبر کی شام کو لاہور جم خانہ میں جامِ شراب نوش کرنے کے لئے متعین کیا گیا تھا، اپنی رپورٹ میں کہا کہ

> "ہماری گیارہویں کور کے گیارہ بریگیڈیئر نااہل اور بزدل ثابت ہوئے اور اس کور کی نو پلٹنیں ناکارہ نکلیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ چند ایک ڈویژن کمانڈر (میجر جنرل) بھی میدانِ جنگ میں نالائق نکلے۔ ان میں جنگی صلاحیت نام کو نہیں تھی، نہ ان میں وہ چستی اور چالاکی تھی جو ایک کمانڈر کے لئے لازمی ہوتی ہے۔ ہمارے کمانڈر جنگی چالوں سے اور پلان بنانے کی اہلیت سے عاری

تھے۔ اپنی اس خامی کو چھپانے کے لئے انہوں نے کرشنامینن کی طرح لوکل کمانڈروں کی سرگرمیوں میں دخل اندازی شروع کر دی۔ اس غلط حرکت کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوکل کمانڈر بھی جنگی مقاصد کے حصول میں ناکام ہو گئے۔ جب وہ اعلیٰ کمانڈروں کی بے جا دخل اندازی کی وجہ سے ناکام ہوئے تو ناکامی کی تمام تر ذمہ داری ان پر ڈال کر انہیں بزدلی اور جنگی نااہلیت کا مجرم ٹھہرایا گیا۔ چند ایک بریگیڈیئر بھی اپنے جرنیلوں کی نااہلی کا شکار ہوئے۔ انہیں سزا دی گئی اور جرنیلوں نے بہادری کے تمغے اپنے سینوں پر لگا لئے۔"

تمغوں کے سلسلہ میں مسٹر انتھونی نے ایک دلچسپ مثال پیش کی۔ اس نے کہا کہ

"ایک ڈویژن آگے پاکستان آرمی کے ہاتھوں کٹ رہا تھا۔ یہ لاہور کا آخری معرکہ تھا جس میں بی آر بی کے کنارے ڈوگرئی گاؤں کی گلیاں اور اردگرد کا علاقہ دونوں فوجوں کے لئے جہنم بنا ہوا تھا۔ بھارتی ڈویژن کمانڈر فرنٹ سے پچیس میل دور تھا۔ مرنے والوں کو کوئی اعزاز نہ دیا گیا۔ جو بریگیڈیئر اور کرنل بہادری سے لڑ کر زندہ بچے انہیں اس جرم میں سزائیں دی گئیں کہ وہ بی آر بی عبور کر سکے۔ مگر پچیس میل دور بیٹھے ہوئے میجر جنرل کو "بہادر چکر" دیا گیا۔ انتھونی نے کہا — "اسے شاید ایسے خونریز معرکے سے پچیس میل دور رہنے کے کمال پر تمغہ دیا گیا[1]۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ تو بھارتی سپاہی بزدل تھے اور نہ ہی ان کے افسر نالائق۔ ان کا مقابلہ عزم و ایقان کے ان فولادی پیکروں سے آن پڑا تھا جو بدر و حنین کی یاد تازہ کرانے کے لئے، کفن بدوش اور شمشیر بدست میدان میں نکل آتے تھے، ساری دنیا پر اس حقیقت کو آشکارا کرنے کے لئے کہ

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اسکی اذانوں سے فاش سرِّ کلیم و خلیل"

---

[1] مسٹر انتھونی کی رپورٹ پر مشتمل کوائف ہمارے ہاں مختلف اخبارات میں شائع ہوئے تھے لیکن ہم نے انہیں سیارہ ڈائجسٹ کی جولائی ۱۹۶۹ء کی اشاعت سے اخذ کیا ہے۔ سیارہ ڈائجسٹ کے مدیر خورشید عالم اور ان کے برادر اصغر عنایت اللہ جنگِ ستمبر کی یادوں کے چراغوں کو جس انداز سے اپنے خونِ جگر سے روشن کئے چلے جا رہے ہیں، اس کے لئے وہ پوری ملتِ پاکستانیہ کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔ دعا ہے کہ

"اللہ ایہناں بھراواں دی جوڑی نوں سلامت رکھے"

ان خدا مست مجاہدین کا یہی یقینِ محکم اور عزمِ راسخ تھا جس سے وہ اس بے جگری سے لڑے کہ دشمن باور ہی نہیں کرتا تھا کہ اس کا مقابلہ انسانوں سے ہے۔ چونڈہ کے معرکہ میں ایک ہندو کیپٹن کو گرفتار کر کے اسکی آنکھوں پر پٹی باندھ کر پچھلے مورچوں کی طرف لایا جا رہا تھا۔ اس نے التجا کی کہ ذرا سی دیر کے لئے اسکی پٹی کھول دی جائے۔ پٹی کھل جانے پر اس نے ہمارے جوانوں پر ایک نظر ڈالی اور کہا کہ اب پٹی باندھ دو۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تمہارے سپاہی واقعی انسان ہیں! انسان تو ایسی بے جگری سے نہیں لڑا کرتے — وہ سچ کہتا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ "انسان" دیکھے تھے۔

ہاں تو، یہ تھے وہ اللہ کے شیر جنہوں نے اپنی جانیں دے کر، نہ صرف ہماری جان، مال، عزت، آبرو کو بچا لیا بلکہ اس خطۂ زمین کو بھی محفوظ کر دیا جسے خدا کے دین کی آماجگاہ بننے کے لئے حاصل کیا گیا تھا ——
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را — !

انہوں نے تو ہمارے لئے یہ کیا، لیکن ہم نے ان کے لئے کیا کیا، اس کے تصور و احساس سے ہماری نگاہیں شرم کے مارے زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں کہا تو بہت کچھ جا سکتا ہے لیکن ہم یہاں صرف ایک واقعہ درج کرتے ہیں جو ہماری غیرت کا ماتم کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس واقعہ کا بیان کرنے والا اسی جنگِ ستمبر کے "باقیات الصالحات" میں کا ایک "ان پڑھ" سا سپاہی ہے جسے اس نے اپنی زبان میں لکھا — اور ہم سیارہ ڈائجسٹ کے مدیر کے حسنِ انتخاب اور لطافتِ ذوق کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اسے انہوں نے اسی سپاہی کی ٹوٹی پھوٹی زبان میں من وعن شائع کر دیا۔ یقین مانئے، دنیا کا بڑے سے بڑا ادیب بھی وہ بات پیدا نہیں کر سکتا تھا جو اس دیہاتی ان پڑھ سے سپاہی کے فطری انداز نے پیدا کر دی ہے۔ چونڈہ کا محاذ تھا اور یہ نوجوان فیلڈ ایمبولینس سے متعلق تھا جس کا فریضہ میدانِ جنگ میں زخمیوں کی دیکھ بھال، اور انہیں پیچھے ہسپتال تک پہنچانے کا اہتمام تھا۔ وہ مختلف معرکوں اور ان میں زخمی اور شہید ہونے والے جوانوں کی تحیر انگیز داستانیں سنانے کے بعد، ایک ایسے نوجوان کا واقعہ سامنے لاتا ہے جس کی ٹانگ ٹینک کے بم سے اڑ گئی تھی۔ وہ کہتا ہے۔

"ہم کو اس جوان کا علم تھا جس کا ٹانگ گولے سے صاف کٹ گیا تھا۔ اس کا سارا خون نکل گیا تو اس کا رنگ لاش کی مافق سفید ہو گیا۔ ہم سمجھ لیا کہ یہ جوان شہید ہو جائے گا۔ ہم جب اس کو سٹیچر پر ڈال کر ٹرک میں لوڈ کیا، وہ بے ہوش تھا۔ ہم بہت پھرتی سے سب زخمی اور شہید کو ٹرک میں لوڈ کیا اور چل پڑا۔ محاذ کے پیچھے بڑا چھوٹا کھڈہ تھا۔ اس کے اندر ہمارا فیلڈ ہسپتال تھا۔ اوپر چھولداری، چھولداری پر جال اور جال کے اوپر جھاڑی اور ڈالی ڈال دیا تھا۔ ہم زخمی کو ادھر بڑا آرام سے اتارا۔ صرف ایک جوان تھا جس کا ٹانگ کٹا تھا۔ باقی صرف زخمی تھا۔ ٹانگ، بازو سلامت تھا۔ ہم سب سے پہلے

ٹانگ والے کا سٹیچر میڈیکل آفیسر کے آگے رکھ دیا۔ میڈیکل آفیسر دیکھا تو گھبرا گیا۔ بولا۔ اوہ۔ اوہ تمام خون چلا گیا۔ فوراً خون لگاؤ۔ اُدھر سے جاؤ۔

ادھر دور درخت کے نیچے تازہ خون دینے کا بندوبست بہت اچھا تھا۔ ہم پھرتی سے سٹیچر ادھر لے گیا۔ نرسنگ اردلی اور دوسرا میڈیکل آفیسر پھرتی سے اس کو خون کا نالی لگا دیا اور کاٹے ہوئے ٹانگ پر صحیح پٹی باندھ دیا۔ سٹیچر زمین پر رکھ دیا تھا۔ یہ ہسپتال پکا نہیں تھا۔ ادھر خون دے کے زخمی کو چھاؤنی کے ہسپتال میں بھیجتا تھا۔ پھر وہ زندہ رہ جاتا تھا۔

ہم اس جوان کے پاس بیٹھ گیا اور اس کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ بالکل لڑکا تھا۔ ابھی پورا جوان نہیں ہوا تھا۔ ابھی بہت تھوڑا مونچھ آیا تھا۔ ہم نے ادھر سوچا۔ یا مولا علیؓ۔ یہ بچہ ہے اور اسکا ٹانگ کٹ گیا ہے۔ اب یہ سارا عمر کیا کرے گا؟ اسکا بھاگنے دوڑنے کا عمر ہے۔ اس کا ماں بہن کیا سوچے گا۔ پر ہم نے سوچ لیا کہ اس لڑکے نے قوم کے واسطے سارا عمر کا کھیل دوڑ قربان کر دیا۔ اس کا ماں باپ افسوس نہیں کریگا۔ پر ہم نے یہ بھی سوچ لیا کہ جس قوم کے واسطے اس نے قربانی دے دیا اس قوم کو کون بتائے گا کہ اس نے قربانی دیا۔ ہم نے سوچ لیا کہ اسکو کوئی اپنی لڑکی کا رشتہ نہیں دیگا۔ بولے گا۔ یہ تو لنگڑا ہے۔ کیا کام کرے گا۔ ہم کو معلوم تھا۔ یہ لڑکا پڑھا ہوا نہیں ہے۔ یہ دفتر میں کیسے کام کرے گا۔ اس کو کوئی چپراسی کا نوکری بھی نہیں دیگا۔ ہم کو بہت غم ہوا۔ پر ہم نے اپنے دل کو تسلی دے لیا کہ ہمارا قوم غیرت والا ہے۔ وہ اس لڑکے کو گلے لگائے گا اور بولے گا کہ اس لڑکے نے ہمارا ماں بہن کا عزت کے واسطے سارا عمر برباد کر دیا۔

تم بھی غور کرو۔ ہم ادھر بہت غور کیا۔ ہم بہت بات سوچا۔ پر ہمارا سارا بات بے فضول تھا۔ پر ہم بہت غور کر لیا۔

اس کے بعد اس نے کہا۔

جنگ ختم ہو گیا۔ پر ہم فوج میں نہیں رہ سکا۔ اس واسطے کہ آخری روز سیالکوٹ کے محاذ پر ہم زخمی کو اٹھا رہا تھا۔ ایک گولہ ہمارے نیڑے پھٹا۔ ہم صاف بچ گیا۔ پر ہمارا ایک آنکھ کا نظر خراب ہو گیا۔ اور بارود اندر جانے سے ہمارا ایک پھیپھڑا بھی خراب ہو گیا۔ ادھر ہمارا بہت علاج ہوا پر کھانسی ٹھیک نہیں ہوا۔ ہم کو دم چڑھ جاتا تھا۔ جب فوج بارک میں آ گیا تو ہم کو میڈیکل پنشن مل گیا۔

اور اب وہ کہانی سنیئے۔ لیکن پہلے اپنے جگر کو تھام لیجیے۔ اس نے کہا۔

تم غور کرو۔ ہم اب جو کہانی سنائے گا وہ سٹوری نہیں ہے۔ سٹوری جھوٹا ہوتا ہے۔ کہانی سولہ آنے

سچا ہوتا ہے۔ ہم گھر چلا گیا ہمارے دل میں اس لڑکے کا بہت خیال آتا تھا۔ ہم کو کدھر نوکری نہ ملا تو ہم سوچتا تھا کہ جس کا ٹانگ کٹ گیا تھا اس کو نوکری کدھر ملیگا۔

ایک سال گزر گیا ہم کو اپنے ماموں نے کراچی سے خط لکھا کہ ادھر آجاؤ نوکری مل جائے گا۔ ہم کراچی چلا گیا۔ دو تین روز پیچھے ہم اپنے ماموں کے ساتھ سڑک پر بس کے واسطے کھڑا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک آدمی پہیوں والا ریڑھی پر سبزی ترکاری بیچتا تھا۔ کراچی میں لوگ سائیکل کے چار پہیے لگا کر چھوٹا سا ریڑھی بناتے ہیں اور گلی گلی چیزیں بیچتے ہیں۔ وہ آدمی ریڑھی کو دھکیل کر ادھر لا رہا تھا جدھر ہم کھڑا تھا۔ پر ہم نے دیکھ لیا کہ وہ آدمی ٹھیک سے نہیں چلتا تھا۔ وہ ایک قدم ٹھیک اٹھاتا ہے پر دوسرا قدم پر اچھلتا ہے۔ ہم اپنے ماموں کو دکھایا کہ دیکھو وہ آدمی کیسا چلتا ہے۔ ایک قدم چلتا ہے، دوسرا قدم اچھلتا ہے۔

جب وہ آدمی ہمارے پاس آکر ریڑھی کھڑا کیا تو ہم دیکھا کہ اس کا دوسرا ٹانگ نہیں تھا۔ گوڈے سے کاٹا ہوا تھا۔ اس نے ریڑھی کے ساتھ پیچھے کر کے لکڑی کا پھٹی لگایا ہوا تھا اور پھٹی پر کپڑے کا گدی بنایا ہوا تھا۔ گدی پر اس نے کاٹا ہوا ٹانگ کا گوڈا رکھا ہوا تھا۔ اس واسطے وہ ایک قدم اچھلتا اور ایک قدم چلتا تھا۔ ہم اس کا کاٹا ہوا ٹانگ اور ٹانگ کو سہارا دینے کا بندوبست دیکھتا رہا۔ پر اس کا ابھی شکل نہیں دیکھا۔ اس نے زور سے آواز دیا ــــ بینگن۔ ٹماٹر۔ شلغم ــــ تو ہم اس کا شکل دیکھا۔ تم میرے اللہ پہ یقین کرو۔ ہمارے دل کو بڑا زور کا چوٹ لگا۔ ہم اس کا شکل کو پہچان لیا۔ یہ وہی نوجوان لڑکا تھا جس نے دشمن کے ٹینک رجمنٹ کو روکا تھا۔ ہم اگلے جہان بھی گواہی دے گا کہ اس کا ٹانگ میرے سامنے کٹ گیا تھا اور ہم اس کو پٹی باندھتا تو وہ غصے میں بولتا تھا کہ ہم مرتا ہے تو پروا نہیں دشمن کا ٹینک آگے نہ جائے۔

ہم اسکو ٹھیک سے پہچان لیا پر ہم نے اسکو اپنا شکل نہیں دکھایا۔ ہم کو شرم آگیا۔ اس واسطے کہ ہم بھی کربلا کے میدان میں گیا تھا پر ٹھیک سے واپس آگیا۔ پر وہ میدان سے ٹھیک سے واپس نہیں آیا۔ وہ بہت بڑا قربانی دیا۔ ہم کیا دیا؟ ہم حیران ہوتا ہے کہ فوج کے زخمی کو لکڑی کا ٹانگ مفت ملتا ہے۔ اس کو کیوں نہیں ملا۔ پر ہم نے سوچ لیا کہ لکڑی کا ٹانگ ضرور ہی ملا ہوگا۔ یہ جوان اس کو پسند نہیں کرتا اور اس کے ساتھ اتنی دور کا پھیری نہیں لگا سکتا۔

خیر وہ اس کا مرضی ہے کہ لکڑی کا ٹانگ لگاتا ہے کہ نہیں لگاتا ہے، پر ہم یہ سوچتا ہے کہ لوگوں کے بھرے ہوئے کراچی شہر میں صرف ہم ایک آدمی نے اس کو پہچان لیا کہ وہ قوم کا غازی ہے۔ اور

کوئی آدمی اس کو نہیں پہچانتا۔

ادھر سے کسی بچے کا زور سے آواز آیا ـــ او لنگڑے سبزی والے! ـــ اس نے پھرتی سے ریڑھی گھمایا اور ادھر کو ریڑھی لے گیا۔ ہم کو بہت غم ہوتا ہے کہ جس نے سیالکوٹ کے میدان میں یا علیؓ کا نعرہ مار کر ٹانگ کٹوا لیا وہ آج بینگن ٹماٹر کا نعرہ مارتا ہے اور لوگ اس کو لنگڑا سبزی والا بولتا ہے۔ ہم کراچی والوں کو اور سارے پاکستان کو سناتا ہے کہ اگر یہ غازی لنگڑا نہ ہوجاتا تو سارا پاکستان لنگڑا ہوجاتا۔

تم غور کرو اور ہم کو بتاؤ کہ تم اس کو کیوں نہیں پہچانتا؟"

سنتے ہیں آپ کہ اس سیدھے سادے مسلمان سپاہی نے کیا کہا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ

ہم کراچی والوں کو اور سارے پاکستان کو سناتا ہے کہ اگر یہ غازی لنگڑا نہ ہوجاتا تو سارا پاکستان لنگڑا ہوجاتا۔

اور اس کے بعد جو اس نے سوال کیا ہے، اسے بھی آپ نے سن لیا ہے! اس نے کہا ہے،

تم غور کرو اور ہم کو بتاؤ کہ تم اس کو کیوں نہیں پہچانتا؟

اور ہم پاکستان کے نو دس کروڑ مسلمانوں سے کہنا چاہتے ہیں کہ اگر ان میں سے کسی کے پاس بھی اس سوال کا جواب ہے تو ہم اس کے سننے کے لئے بیتاب ہیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہمارے پاس اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں کہ

حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے (اقبالؒ)

اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے محکمۂ دفاع نے، جنگ میں زخمی ہونے والے غازیوں، اور شہید ہونے والوں کے پسماندگان کے لئے، قاعدے اور قانون کے مطابق جو کچھ ممکن ہے کیا ہوگا۔ لیکن یہ غازی اور ان کے بچے ساری قوم کی متاع ہیں۔ سوال یہ ہے کہ قوم نے ان کے لئے کیا کیا ہے۔ اور یہی وہ سوال ہے جس کے جواب میں ہماری نگاہیں شرم کے مارے زمین میں گڑ جاتی ہیں اور قوم کی یہی بےحسی اور بےرخی ہے جس کا سبب ہم نے قومی غیرت کا فقدان قرار دیا ہے۔ پاسبانانِ ملت کا کیا مقام ہوتا ہے، اس کے لئے آپ قرآن کریم کی ان صدہا آیات کو سامنے لائیے جن میں مجاہدین اور مقتولین فی سبیل اللہ کے مدارج و مناصب کے درخشندہ تذکرے محفوظ ہیں۔

یہ کچھ تو ہم اپنی قوم کو کہیں گے لیکن اس کے ساتھ ہی ہم جنگِ ستمبر میں جان دینے والے شہیدوں، اور زندہ رہنے والے غازیوں کی خدمت میں "بصد احترام و بہزار عقیدت" عرض کریں گے کہ

ہم آپ کی روحوں سے، اور آپ کی نظروں سے، بحد شرمسار ہیں کہ ہم نے آپ کیلئے کچھ نہیں کیا۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ آپ نے جو کچھ کیا تھا کسی مزد و معاوضہ کی توقع کے بغیر، اور ہرقسم کے صلہ وستائش کی تمنا سے بے نیاز ہو کر ایک مقدس فریضہ کی حیثیت سے کیا تھا۔ تمہاری قربانیاں اس قدر گراں بہا ہیں کہ ساری دنیا کی دولت بھی ان کا معاوضہ نہیں بن سکتی. یقین مانیے کہ

جب تک اس مقدس سرزمین کا وجود باقی ہے ـــ خدا اسے ابد تک باقی رکھے۔
جب تک ہلالی پرچم ان فضاؤں میں پرفشاں ہے ـــ خدا اسے ہمیشہ کیلئے پرفشاں رکھے۔
آسمان کے ستارے تمہارے احترام میں سرنگوں رہینگے اور خدا اور اس کے فرشتے، تم پر صلوٰۃ وسلام کے پھول برساتے رہینگے۔

یہ صلہ سب سے عظیم صلہ، اور یہ معاوضہ سب سے زیادہ گراں بہا معاوضہ ہے۔ ہماری، اور ہماری آنے والی نسلوں کے کروڑوں، اربوں، افراد کی زندگی، تمہارے پاکیزہ خون کے قطرات کی رہینِ منت ہے۔

جہادِ ستمبر کے شہیدو اور غازیو! ان کروڑوں، اربوں زندگیوں کا سلام محبت قبول کرو۔ حقیقت یہ ہے ـــ کہ ما شایانِ شانِ تو نہ بودیم!

ـــــــ (پ۔ز) ـــــــ

۱۴ راگست

۱۴ راگست (یومِ آزادی) کی واجب الاحترام تقریب پر ملک میں بڑے بڑے سیاسی راہ نماؤں نے تقریریں کیں۔ بیانات دیئے۔ اخبارات کے خاص نمبر شائع ہوئے اور ان میں بڑی بڑی اہم ہستیوں کے مقالات شائع ہوئے۔ ان سب سے جو عمومی تاثر پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ یہ ہندوؤں کی تنگ نظری، مسلمانوں کے خلاف ان کی جفاکیشی اور ستم کوشی تھی جس کی وجہ سے مسلمان ان سے علیحدہ ہو جانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہندو ذرا فراخ حوصلگی اور کشادہ ظرفی کا ثبوت دیتا تو پھر مسلمان اپنی جداگانہ مملکت کا مطالبہ نہ کرتے۔

ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا یہی تھا مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ اور کیا یہی ہے ہماری جداگانہ مملکت کی وجہ جواز؟ اگر ان حضرات کو قرآن کے ورق الٹنے کی توفیق یا فرصت نہیں تھی تو وہ کم از کم قائد اعظم کی تقاریر اور بیانات ہی کو سامنے رکھ لیتے جن میں انہوں نے اس مطالبہ کا جذبہ محرکہ اور وجہ جواز نہایت واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اس میں انہیں نظر آتا کہ

پاکستان کا مطالبہ ہمارے دین کا تقاضا تھا۔ اس کا جذبۂ محرکہ صرف یہ تھا کہ مسلمان اپنی آزاد مملکت کے بغیر صحیح اسلامی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اسلام کے ایک زندہ نظام بننے کے لئے ایک آزاد خطۂ زمین کی ضرورت بنیادی اور لازمی ہے۔

یہ اور صرف یہ تھا مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاتا ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس حقیقت کو اس قدر عام کیا جائے کہ یہ ہماری نژادِ نو کے دل میں محکم طور پر جاگزیں ہو جائے ۔۔۔ اے کاش! اور نہیں تو ۱۴ اگست کے دن ہی ایسا ہو جایا کرے!

غنیمت ہے کہ مودودی صاحب نے بالآخر اس کا اعتراف کر لیا کہ

> ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہم نے غیروں کی حکومت سے آزادی حاصل کی تھی اور اس کے لئے ہم بارگاہِ ربُّ العزت شکر گذار ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہ ہمارے خدا کی طرف سے بے بہا انعام تھا۔ (ہمارے) جو نوجوان آزادی کے بعد پیدا ہوئے یا سن بلوغ کو پہنچے ہیں وہ اس کا تصور ہی نہیں کر سکتے کہ انگریزوں کی غلامی میں ہماری حالت کس قدر تأسف انگیز تھی۔ اسلئے وہ اس کا بھی احساس نہیں کر سکتے کہ یہ آزادی کس قدر عظیم نعمت تھی جس سے ہمیں خدا نے نوازا تھا۔
>
> (پاکستان ٹائمز۔ بابت ۱۴ اگست ۱۹۶۹ء)

ورنہ جب ان سے تقسیمِ ہند سے پہلے کہا جاتا کہ آپ تحریکِ پاکستان کی مخالفت اور نہیں تو کم از کم اس خیال ہی سے چھوڑ دیجئے کہ اس سے ہمیں انگریز کی غلامی سے نجات حاصل ہو جائے گی، تو اسکے جواب میں آپ فرماتے کہ

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان کثیرالتعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے .... مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے ..... مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپریلیزم سے آزاد کرایا جائے۔
>
> (ترجمان القرآن، بابت ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ)

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے" تو مودودی صاحب کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ مسلمانوں کو انگریزی امپریلیزم سے نجات مل جائے۔ اب معلوم نہیں وہ کس حیثیت سے اسے خدا کا انعام قرار دے رہے ہیں!

عالمِ افلاک
قرآن کریم کی روشنی میں!

امریکہ کے خلانورد، چاند پر گئے، واپس آگئے، اور اب وہاں کے سائنسدان ان اشیا کا تجزیہ کرنے میں مصروف ہیں جنہیں وہ وہاں سے ساتھ لائے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں ابھی تک یہ بحثیں جاری ہیں کہ آیا انسان کے لئے ممکن بھی ہے کہ وہ چاند پر اپنے قدم رکھ سکے۔ چنانچہ اس دوران میں ہمیں متعدد استفسارات موصول ہوئے ہیں جن میں اس موضوع پر قسم قسم کی باتیں دریافت کی گئی ہیں — اور دریافت کی گئی ہیں علمی نقطۂ نگاہ سے نہیں، بلکہ مذہبی زاویۂ نظر سے۔ ان میں بعض استفسارات اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگوں کی طرف سے بھی ہیں، لیکن جو کچھ پوچھا گیا ہے وہ ایسا مضحکہ انگیز ہے کہ وہ باعثِ حیرت بھی ہے اور وجۂ ندامت بھی۔ اس سے بار بار احساس یہ ابھرتا ہے کہ

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

ان استفسارات میں بالواسطہ یا بلاواسطہ، قدرِ مشترک یہ ہے کہ اجرامِ فلکی کے متعلق قرآنِ کریم نے کیا کہا ہے۔ اور ہم آج کی نشست میں مختصر طور پر اسی سوال کا جواب پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآنِ کریم نہ سائنس کی کتاب ہے نہ فلکیات اس کا موضوع ہے۔ وہ سفرِ حیات میں انسان کو راہ نمائی دیتا ہے اور "آدمی" کو "انسانی سطح" پر زندگی بسر کرنے، اور اس طرح زندگی کے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کا طریق بتاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے، خالقِ کائنات، کائنات اور انسانی ممکنات کا ذکر ناگزیر ہے۔ اس میں "ارض و سما" کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اسی ضمن میں کہا گیا ہے۔ لیکن چونکہ وہ اس خدا کی کتاب ہے جو ارض و سما کا خالق اور علیم و خبیر ہے، اسلئے ہو نہیں سکتا کہ کارگہِ کائنات کے متعلق،

کسی جہت سے بھی اس میں کوئی بات آئی ہو اور وہ حقیقت کے خلاف ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے (یعنی قرآنی) دعاوی کی صداقت کے ثبوت میں یہ بھی کہا ہے کہ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَ فِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۔ ہم خارجی کائنات اور انسانی دنیا (دونوں) میں انہیں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے تاآنکہ یہ بات نکھر کر سامنے آجائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ مبنی برحقیقت ہے۔ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۔ (۴۱/۵۳) یہ اس لئے کہ کائنات کی کوئی شے خدا کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں اور یہی اس بات کی کافی دلیل ہے کہ وہ جو کچھ کائنات کے متعلق کہے گا حقیقت ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی علم جوں جوں رموز فطرت کو واشگاف اور اسرار کائنات کو بے نقاب کرتا جائے گا، قرآن کی صداقت حقیقت بن کر سامنے آتی جائے گی۔

دوسری بات یہ سمجھ لینے کے قابل ہے کہ قرآن کریم نے اپنی پہلی ہی سورۃ میں، قصۂ آدم کو اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے، تو وہ کسی فرد کی داستان نہیں بلکہ خود "آدمی" کے خواص، کیفیات اور ممکنات کا بیان ہے۔ اس تخلیق نو کے خلاف ملائکہ نے یہ اعتراض کیا کہ اسے کس خصوصیت کی بنا پر زمین میں صاحب اقتدار بنایا جا رہا ہے جب کہ اس کے ہیولیٰ کے عناصر اس حقیقت کے غماز ہیں کہ یہ وہاں خوں ریزیاں کرے گا اور فساد انگیزیاں۔ (۲/۳۰)۔ اس کے برعکس ہم ہیں کہ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ۔ (۲/۳۰) "ہم تیری تسبیح و تقدیس میں مصروف رہتے ہیں"۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۔ "ہم وہ کچھ جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے"۔ یہ کہہ کر انہیں (معاذ اللہ) آمرانہ طریق سے خاموش نہیں کر دیا گیا بلکہ اس کی وجہ بھی بتا دی گئی۔ اور وہ یہ کہ وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (۲/۳۱) آدمی میں جملہ اشیائے فطرت کے متعلق علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھ دی۔ اس تحصیل علم کی حیثیت محض نظری نہیں تھی۔ اس کا عملی نتیجہ یہ تھا کہ فطرت کی قوتیں آدمی کے سامنے سجدہ ریز ہو گئیں۔ آدم مسجود ملائکہ بن گیا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر یہ کہہ کر دہرایا ہے کہ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ (۴۵/۱۳) ۔ ارض و سماوات میں جو کچھ ہے، خدا نے اسے اپنی طرف سے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان میں اس امر کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ وہ کارگہ کائنات کی ہر قوت کو مسخر کرے۔ لہٰذا، دنیا میں جب جہاں اور جو انسان یا قوم، کوئی سائنٹیفک انکشاف ۔۔۔ اور اس طرح فطرت کی کسی قوت کو مسخر ۔۔۔ کر لیتی تو اس کی یہ کوشش ہمارے نزدیک درخور تبریک و تہنیت ہوگی کیونکہ اس سے ایک تو خدا کے اس دعویٰ کا عملی ثبوت سامنے آجائے گا جسے اس نے ملائکہ کے سامنے پیش کیا تھا، اور دوسرے قرآن کریم کے مبنی برحقیقت ہونے کی ایک اور

دلیل واضح ہو جائے گی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ انسان جو چاند پر پہنچا ہے تو عالمِ اسلامی میں اس تقریب پر چراغاں ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب اس قوم کے سامنے خدا کی کتاب بے نقاب ہوتی اور یہ اس پر غور و فکر کرتی۔ کیونکہ جب اس نے کہا تھا کہ "ارض و سماوات تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے" تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ۔ (۴۵/۱۳) اس میں..... اس قوم کے لئے نشانیاں ہیں جو غور و تفکر سے کام لے۔ جو قوم عقل و فکر اور علم و بصیرت سے کام لینا چھوڑ دے، اس کے لئے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا تو ایک طرف، تسخیرِ فطرت کی اہمیت کا سمجھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔

(۲) اس تمہید کے بعد، ہم موضوعِ زیرِ نظر کی طرف آتے ہیں۔ قرآن کریم میں "ارض و سماوات" کے الفاظ بے شمار مقامات پر آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ارض کے معنی ہیں پستی اور سماء کے معنی ہیں بلندی۔ لہٰذا سماء کے معنی (ہمارے مفہوم کے مطابق) آسمان نہیں ہونگے۔ ہمیں جو کچھ اپنے اوپر دکھائی دیتا ہے، وہ سب "سمٰوٰت" کے زمرہ میں آجائیگا ـــــ کرۂ ارض کے اوپر فضا۔ چاند۔ سورج۔ ستارے۔ مرئی اور غیر مرئی، معلوم و نامعلوم، جملہ اجرامِ فلکی، سب ہمارے لئے سماء ہوں گے۔ اصل یہ ہے کہ ارض (پستی) اور سماء (بلندی) اضافی الفاظ ہیں۔ ہم جو کچھ اپنے اوپر دیکھتے ہیں وہ ہمارے لئے سماء ہے اور اس کے لئے ہم ارض ہیں۔ اور جو کچھ ہمارے نیچے ہے وہ ہمارے لئے ارض ہے اور ہم اس کے لئے سماء۔ یعنی ہر سماء کی ایک ارض ہوتی ہے اور ہر ارض کا ایک سماء۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآنِ کریم نے ان مختصر الفاظ میں (نہایت جامعیت سے) بیان کر دیا ہے کہ اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَھُنَّ۔ (۶۵/۱۲) خدا وہ ہے جس نے متعدد سمٰوٰت پیدا کئے اور ہر سماء کے مقابل میں ایک ارض۔ (عربی زبان میں "سَبْعٌ" کا لفظ جہاں "سات" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، وہاں اس سے مراد "متعدد" بھی ہوتے ہیں۔ جیسے ہم اپنے ہاں کہتے ہیں کہ "میں نے تمہیں بیسیوں مرتبہ کہا ہے، سو بار تاکید کی ہے، ہزار بار منع کیا ہے"۔ ان الفاظ سے مراد "متعین طور پر بیس، سو یا ہزار نہیں ہوتا" بلکہ اس سے مقصد کثرت یا متعدد بار ہوتا ہے۔ اسی انداز سے عربی زبان میں "سات۔ ستر۔ سات سو وغیرہ الفاظ آتے ہیں)۔

(۳) قرآنِ کریم میں خدا کو بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲/۱۱۷) اور فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۴/۱۰) کہا گیا ہے۔ بَدِیْعٌ یا فَاطِرٌ کے معنی ہوتے ہیں وہ جو کسی کام کو پہلی مرتبہ کرے۔ لہٰذا خدا کے بدیع اور فاطر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ ارض و سمٰوٰت (مسئلہ کائنات) کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ مادی کائنات، ازلی اور قدیمی نہیں۔ خدا نے اسے پیدا کیا ہے اور اس طرح پیدا کیا ہے کہ اس سے

پہلے ان کا وجود ہی نہیں تھا

یہ ابتدا کے لئے ہے۔ جہاں تک انتہا کا تعلق ہے، قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے کہ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی۔ (۱۳/۲) یہ تمام اجرام ایک مدت معینہ تک کے لئے محوِ خرام ہیں۔ یعنی یہ نہ ازلی ہیں نہ ابدی۔ ازلی اور ابدی ہونا صرف خدا کے لئے ہے ..... مخلوق کے لئے نہیں۔

(۴) تخلیقِ سماء کے متعلق ایک مقام پر ہے وَھِیَ دُخَانٌ۔ (۴۱/۱۱) ابتدا میں یہ دخان تھا۔ دخان دھوئیں۔ ابخرات یا گیس (GASEOUS MATTER) کو کہتے ہیں۔ یہ (NEBULA) کی وہ ہیئت ہے جس میں اجرامِ فلکی کی پہلے پہل نمود ہوئی تھی۔ پہلے یہ ہیولیٰ ایک ہی تھا۔ اس کے بعد اس میں سے چھینٹے اڑنے اور مختلف اجرام الگ الگ ہو گئے۔ سورۂ انبیاء میں ہے۔ اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا۔ (۲۱/۳۰) یہ لوگ جو قرآن کے دعاوی کی صداقتوں سے انکار کرتے ہیں کیا انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ ارض و سمٰوٰت پہلے ایک ہی ہیولیٰ تھے۔ پھر یہ پھٹ کر الگ الگ ہوئے۔ زمین کے متعلق دوسرے مقام میں ہے کہ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِکَ دَحٰھَا (۷۹/۳۰) اس کے بعد زمین کو اس طرح دور پھینکا جس طرح گوپئے سے پتھر کو زناٹے کے ساتھ دور پھینکتے ہیں۔ یہ کرے اس شدت اور تیزی کے ساتھ الگ ہوتے کہ کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ۔ (۲۱/۳۳) ان میں سے ہر ایک کرہ اپنے اپنے مدار (ORBIT) میں تیرتا چلا جا رہا ہے۔ زمین کی یہ کیفیت ہے کہ یہ تمہیں اپنے اوپر لئے اس انداز سے گھوم رہی ہے کہ تم آرام اور سکون سے بیٹھے رہتے ہو۔ تمہیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ محوِ گردش ہے۔ تَمِیْدَ بِکُمْ کے یہی معنی ہیں۔ (۱۶/۱۵)

پھر یہ کرے مختلف ادوار (STAGES) میں سے گزرے۔ قرآن کریم میں سِتَّۃِ اَیَّامٍ آیا ہے (۱۱/۳) چھ مختلف ادوار۔ کہیں ان مراحل کو کلی طور پر یَوْمَیْنِ (دو مراحل) بھی کہا ہے (۴۱/۱۲) ان میں سے ایک ایک یوم ہزار ہزار (۳۲/۵) بلکہ پچاس پچاس ہزار سال (۷۰/۴) کا بتایا گیا ہے۔ (علمِ انسانی ہنوز اس مقام تک نہیں پہنچا کہ ان ادوار کو متعین کر سکے۔ سائنس کے مزید انکشافات ایک دن اس حقیقت کو بھی واضح کر دیں گے)۔

ان مراحل سے گذرنے کے بعد زمین پر پانی کی نمود ہوئی اور پانی سے ہر جاندار شے وجود میں آئی۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (۲۱/۳۰) زندگی کی نمود کے لئے تو پانی کافی تھا لیکن اس کی حفاظت کے لئے کچھ اور بھی درکار تھا۔ یہ وہ کرۂ فضائی (ATMOSPHERE) ہے جس کے بغیر یہاں کوئی جاندار مخلوق باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ اسے قرآن نے سَقْفًا مَّحْفُوْظًا کہہ کر پکارا ہے۔ (۲۱/۳۲)۔ وہ چھت جو خود

بھی محفوظ ہے اور ساکنانِ ارض کے لئے سامانِ حفاظت بہم پہنچاتی ہے۔ کرۂ فضائی ہمارے لئے کس کس قسم کے سامانِ حفاظت بہم پہنچاتا ہے اسکا اندازہ اس سے لگائیے کہ چاند اگرچہ زمین کا توام ہے لیکن اس پر زندگی کی نمود نہیں ہو سکی۔ یہ اس لئے کہ اس کے اوپر کرۂ فضائی نہیں ہے۔ اگر ہمارے سر پر بھی یہ "سقف محفوظ" نہ ہوتی تو ہماری زمین بھی چاند کی طرح ویرانہ ہوتی۔

(۵) یہ اجرام اپنے ابتدائی ہیولیٰ سے الگ ہوتے اور اپنے اپنے مدار میں مصروفِ گردش ہو گئے لیکن ان میں اس قسم کی باہمی کشش پیدا کی گئی کہ یہ فضا میں معلق ہیں۔ نہ گرتے ہیں نہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ اس کشش کو قرآن کریم نے غیر مرئی ستون (INVISIBLE PILLARS) کہہ کر پکارا ہے۔ سورۃ الرعد میں ہے۔ اَللّٰہُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَہَا۔ (۱۳/۲) اللہ وہ ہے جس نے اجرامِ سماوی کو ایسے ستونوں سے بلندی پر قائم رکھا ہے جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے۔ "دیکھ نہیں سکتے" کہا ہے، "سمجھ نہیں سکتے" نہیں کہا۔

(۶) کائنات کا یہ سلسلہ اس قدر وسعت ناآشنا اور تحیر انگیز ہے کہ انسانی فکر اس کے کسی ایک ادنیٰ سے گوشے کو بھی بہ نگاہِ تعمق دیکھے تو اس کا سر چکرا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ تمام سلسلہ جس نظم و نسق کے ساتھ سرگرم عمل ہے، اس کی بنیاد کیا ہے؟ قرآن کریم نے اسے ایک لفظ میں سمو کر رکھ دیا ہے اور وہ لفظ ہے "خدا کا امر" —— یعنی قانونِ خداوندی —— یہ محیر العقول کارگہ کائنات، قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوتے ہے۔ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِہٖ۔ (۷/۵۴)۔ سورج، چاند، ستارے، سب، خدا کے قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوتے ہیں۔ اور اس کے قانون کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ذرا سی بھی تبدیلی نہیں آتی۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا۔ (۳۳/۶۲) یہ قانونِ خداوندی کا محکم اور غیر متبدل ہونا ہے کہ انسان زمین پر بیٹھا، محض حسابی قاعدے سے، ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے اور اس کا کوئی نشانہ خطا نہیں جاتا۔ یہ قانون اس قدر اٹل ہے کہ اس کے بھروسے پر، ایک خلانورد دہکتے جہاز سے باہر نکل کر، فضا میں ٹہلنے لگ جاتا ہے، اور امریکہ کا کنٹرول اسٹیشن، دو لاکھ اسی ہزار میل کے فاصلے سے نیچے بیٹھا، چاند پر جانے والے جہاز کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتا اور خلانوردوں کو ہدایات دیتا ہے۔ اور یہ اس کے قانون ہی کی محکمیت ہے جس کے بل بوتے پر، زمین سے چھ کروڑ میل دور، فضائی جہاز، مریخ کی تصویریں ٹیلیویژن پر بھیج رہا ہے۔ یہ اس کے محکم قانون ہی کی کارفرمائی ہے جس سے حالت یہ ہے کہ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّہَا۔ سورج، اپنے مدار ہی کے گرد گردش نہیں کرتا بلکہ (اپنے پورے نظام کو ساتھ لئے) کسی اور منزل کی طرف رواں دواں چلا جا رہا ہے جو اس کا مستقر ہے۔ ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ۔ (۳۶/۳۸)

یہ اُس خدا کے مقرر کردہ پیمانوں کے مطابق ہو رہا ہے جو بڑی قوتوں کا مالک ہے اور اس کی قوت علم پر مبنی ہے۔
یہ اُس کے قانون ہی کی کارفرمائی ہے کہ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ (۳۶/۳۹) خدا نے چاند کے لئے منازل مقرر کر دی ہیں جن کی وجہ سے اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ پہلی رات 'ناخن کی طرح باریک سا' جاتے سامنے آتا ہے۔ آہستہ آہستہ مہ کامل بن جاتا ہے۔ پھر گھٹتے گھٹتے، اسی طرح باریک سی ٹہنی کی طرح نظر آتا ہے۔

اور یہ اسی کا قانون ہے جس کے مطابق لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ سورج جیسا عظیم الجثہ کرہ، اپنی حدود سے آگے بڑھ کر چاند کے اوپر چڑھ جائے۔ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ۔ نہ ہی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دن اور رات کی گردشیں الٹی ہو جائیں۔ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (۳۶/۴۰)۔ ہر کرہ اپنے اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔ ان کروں کی غیر متبدل گردشوں کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے ہاں کیلنڈر مقرر کرتے ہیں جو انسان کی تمدنی زندگی کے لئے اس قدر ناگزیر ہے۔ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ (۵۵/۵) چاند اور سورج نہایت محکم حسابی قاعدے کے مطابق چل رہے ہیں اور ان کی یہ منازل اس لئے مقرر کی گئی ہیں لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ (۱۰/۵) تاکہ تم ان سے سالوں کی گنتی اور مختلف قسم کے حساب کر سکو۔ (نیز ۱۷/۱۲)

(۷) قرآن کریم میں سورج کو ضیاء اور چاند کو نور کہا گیا ہے۔ (۱۰/۵)۔ ویسے تو ضیاء اور نور دونوں کے معنی روشنی ہیں لیکن لغت کی رو سے عام طور پر، ضیاء کسی کی اپنی روشنی کو کہتے ہیں اور نور اس روشنی کو جسے کسی اور سے اکتساب کیا گیا ہو۔ سورۃ الشمس میں اس کی وضاحت یہ کہہ کر کی گئی ہے کہ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا۔ سورج اور اس کی روشنی۔ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا۔ (۹۱/۱-۲) اور چاند، جب وہ روشنی مستعار لینے کے لئے اس کے پیچھے پیچھے پھرتا ہے۔ وہ سورج سے روشنی کی بھیک مانگتا ہے اور بھکاریوں کی طرح اس کے پیچھے پیچھے پھرتا ہے۔ کیسا حسین ہے یہ استعارہ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے کہ چاند، جو لوگوں کی نگاہوں میں بقعۂ نور ہوتا ہے، خود روشن نہیں بلکہ اپنی روشنی کے لئے سورج کا محتاج ہے۔ یہ سورج کی روشنی ہے جو اس سے منعکس ہوتی ہے۔

(۸) فلکیات کے ضمن میں قرآن کریم میں ایک آیت ہے ......

لیکن قبل اس کے کہ ہم اس آیت کو درج کریں، اسے ذہن میں رکھئے کہ یہ آیت لوگوں کے سامنے چھٹی صدی عیسوی میں آئی ہے۔ اُس زمانے میں فلکیات سے متعلق انسانی علم کی جو کیفیت تھی وہ اربابِ علم سے پوشیدہ نہیں۔

پھر جس شخص کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ دنیا تک پہنچتے ہیں وہ اُس ملک کا رہنے والا ہے جو اُس زمانے میں بھی، دیگر اقوام کے مقابلہ میں علمی تحقیقات میں بہت پیچھے تھا۔ "علمی تحقیقات" تو ایک طرف، وہ لوگ زندگی کے عام حقائق سے بھی ناآشنا تھے۔

اور جس شخص کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکلتے ہیں، وہ خود اُمّی تھا۔ یعنی نزولِ قرآن سے پہلے، پڑھنا لکھنا تک نہیں جانتا تھا۔

وہ شخص اُس زمانے میں اور اُس ملک میں، اعلان کرتا ہے کہ

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِیْھِمَا مِنْ دَآبَّۃٍ۔ وَھُوَ عَلٰی جَمْعِھِمْ اِذَا یَشَآءُ قَدِیْرٌ۔ (۴۲/۲۹)

اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اُس نے ارض و سمٰوٰت کی تخلیق کی اور ان دونوں میں جاندار مخلوق کو پھیلا دیا۔ (اِس وقت یہ سب الگ الگ ہیں۔ لیکن) خدا اس پر بھی قادر ہے کہ وہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق، جب چاہے، ان اجرام میں باہمی رابطہ پیدا کر دے (یا ان کی آبادیوں کو ملا دے)۔

ہم پوچھتے یہ ہیں کہ چھٹی صدی عیسوی میں، سرزمینِ عرب کا ایک اُمّیؐ تو ایک طرف، ابھی کل تک، دنیا کا بڑے سے بڑا سائنٹسٹ بھی یہ کہہ سکتا تھا کہ زمین اور آسمانی کرّوں میں باہمی ربط و ضبط پیدا ہو سکتا ہے؟ اور یہ کہ آسمانی کرّوں میں زندگی کا امکان ہے؟ کیا یہ ایک آیت، اس دعویٰ کی مثبت دلیل نہیں کہ کہ قرآن، کسی انسان کے فکر کی تخلیق نہیں۔ اس کا سرچشمہ ماوراءِ علمِ انسانی ہے۔ اسی کو وحیٔ خداوندی کہتے ہیں۔ یہ عظیم حقیقت تو ایک طرف، اُس زمانے میں تو یہ بات بھی کسی کے ذہن میں نہیں آ سکتی تھی کہ آسمانی کرّوں کو انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔ اُس عہد میں تو انسان چاند، سورج، اور ستاروں کو دیوتا سمجھ کر ان کی پرستش کیا کرتا تھا —— اور یہ کچھ ابھی کل تک ہوتا تھا اور آج بھی بعض مقامات پر ہو رہا ہے —— یہ قرآن تھا جس نے ان لوگوں سے کہا کہ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَھُنَّ (۴۱/۳۷) سورج اور چاند کو سجدے مت کرو۔ ان کے سامنے مت جھکو۔ اس خدا کے سامنے جھکو جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اس نے اسے بھی واضح کر دیا کہ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَکْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ (۴۰/۵۷) خارجی کائنات کی تخلیق، انسان کی پیدائش کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خدا کی کبریائی کی متقاضی تھی۔ لیکن چونکہ انسان کو عظیم قوتوں کا حامل بنایا گیا ہے اسلئے یہ مسجودِ کائنات ہے۔ کائنات اسکی معبود نہیں ہو سکتی۔ اسلئے اسے اجرامِ فلکی کے سامنے سجدہ ریز ہونا نہیں چاہیئے۔ ایسا کرنا شرفِ انسانیت کی تذلیل ہے۔

(۹) بہرحال یہ تھی اُس زمانے میں انسان کی ذہنی اور علمی سطح۔ ظاہر ہے کہ ہمارے مفسرین حضرات بھی اُسی زمانے کی پیداوار اور اُسی ماحول سے متأثر تھے۔ اس لئے انہوں نے ان آیاتِ قرآنی کی تفسیر اپنے دور کے رائج الوقت خیالات کے مطابق کی ــــ وہ یہی کر سکتے تھے۔ (مثلاً) ہمارے ہاں امام ابن کثیرؒ کی تفسیر بڑی قابلِ اعتماد سمجھی جاتی ہے۔ انہوں نے تخلیقِ ارض و سموٰت کے سلسلہ میں مختلف آیات کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عباسؓ اور دیگر صحابہؓ سے مروی ہے کہ اللہ تبارک و تعالےٰ کا عرش پانی پر تھا اور کسی چیز کو پیدا نہیں کیا تھا۔ اور جب مخلوق کو رچانا چاہا تو پانی سے دھواں بلند کیا۔ وہ اونچا چڑھا اور اس سے آسمان بنائے۔ پھر پانی خشک ہو گیا اور اس کی زمین بنائی۔ پھر اسی کو الگ الگ کر کے سات زمینیں بنائیں۔ اتوار اور پیر کے دو دن میں یہ ساتوں زمینیں بن گئیں۔ زمین مچھلی پر ہے اور مچھلی وہ ہے جس کا ذکر قرآنِ مجید کی اس آیت میں ہے۔ نٓ۔ وَالْقَلَمِ۔ مچھلی پانی میں ہے اور پانی صفاۃ پر ہے اور صفاۃ فرشتے پر اور فرشتہ پتھر پر۔ اور یہ پتھر وہ ہے جس کا ذکر حضرت لقمان نے کیا ہے۔ یہ پتھر ہوا پر ہے۔ مچھلی کے ہلنے سے زمین کانپنے لگی تو اللہ تعالےٰ نے پہاڑوں کو گاڑ دیا اور وہ ٹھہر گئی۔ (پارۂ اول۔ اردو ترجمہ۔ صفحہ ۷۶)

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں۔

> مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے زمین کو آسمان سے پہلے پیدا کیا۔ اس سے جو دھواں اوپر چڑھا اس سے آسمان بنائے جو ایک پر ایک اس طرح سات ہیں اور زمینیں ایک کے نیچے ایک اس طرح سات ہیں۔

چوبیسویں پارہ (سورۂ فصلت) کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

> ابن جریرؒ کی روایت میں ہے کہ یہودیوں نے حضورؐ سے آسمان و زمین کی پیدائش کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ اتوار اور پیر کے دن اللہ تعالےٰ نے زمین کو پیدا کیا۔ اور پہاڑوں کو منگل کے دن پیدا کیا اور جتنے نفعے ان میں ہیں، اور بدھ کے دن درختوں کو، پانی کو، شہروں کو اور آبادی اور ویرانے کو پیدا کیا تو یہ چار دن ہوئے ... جمعرات والے دن آسمان کو پیدا کیا اور جمعہ کے دن ستاروں کو اور سورج، چاند کو اور فرشتوں کو پیدا کیا تین ساعت کے رہنے تک۔ (صفحہ ۵۵-۵۶)

یہ حضرات' اپنے زمانے کے مروجہ خیال کے مطابق' اس نیلگوں فضا کو آسمان کہتے تھے جو ہمیں اپنے سر پر نظر آتی ہے۔ وہ اسے چوڑا اور ہموار سمجھتے تھے۔ اور سبع سموٰت سے مراد یہ لیتے تھے کہ اسی قسم کے سات آسمان' درمیانی فاصلوں کے بعد اوپر تلے رکھے ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ سورۂ نازعات کی تفسیر کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

آسمان کو اس نے بنایا۔ یعنی بلند و بالا۔ خوب چوڑا اور کشادہ اور بالکل برابر بنایا۔ پھر اندھیری راتوں میں خوب چمکنے والے ستارے اس میں جڑ دیئے۔ (صفحہ)

ہماری کتب تفاسیر میں زمین اور آسمان کے متعلق اسی قسم کی باتیں لکھی ہیں۔ اس میں ان حضرات کا کوئی قصور نہیں۔ اُس زمانے کی علمی سطح ہی ایسی تھی۔ اگر ہم اس زمانے میں ہوتے تو ہم بھی یہی کچھ لکھتے۔ ان حضرات کے مقابلہ میں ہماری پوزیشن اس لئے بہتر (ADVANTAGEOUS) ہے کہ ہمارے زمانے کی علمی سطح بلند ہو گئی ہے جس کی وجہ سے ہم رموزِ کائنات' فلہذا' قرآن کو سمجھنے کے زیادہ قابل ہو گئے ہیں۔

ان تفاسیر نے جو خرابی پیدا کی ہے وہ ان کے اس قسم کے مندرجات کی وجہ سے نہیں بلکہ ہمارے ہاں کے ایک غلط زاویۂ نگاہ کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ تفاسیر ہمارے دینی مکتبوں اور دارالعلوموں میں پڑھائی جاتی ہیں اور ان کے متعلق عقیدہ یہ پیدا کر لیا گیا ہے کہ ان میں جو کچھ لکھا ہے حرفاً حرفاً صحیح ہے۔ ان پر کسی قسم کی تنقید کرنا سخت گناہ ہے کیونکہ سلف صالحین کا اتباع ہی اصلِ دین ہے۔ معاملہ اگر یہاں تک ہی رہتا تو اس سے' کسی نہ کسی طرح بچاؤ کی صورت نکل سکتی تھی —— ہم میں وہ گروہ بھی تو ہے جو تقلیدِ ائمہ کو جائز نہیں قرار دیتا —— لیکن معاملہ اس سے آگے بڑھ گیا۔ ان (مفسرین) حضرات نے جو کچھ لکھا اس کے متعلق یہ نہیں کہا کہ وہ ان کے اپنے خیالات ہیں۔ کہا یہ کہ وہ تفسیر خود حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ ہے۔ اس سے اصل دشواری پیدا ہوئی۔ ان مفسرین کے اقوال سے یہ کہہ کر اختلاف کرنے کی جرأت کرلی جاسکتی تھی کہ وہ بالآخر ہمارے ہی جیسے انسانوں کے خیالات ہیں۔ لیکن جب کہا یہ جاتے کہ وہ خیالات ان حضرات کے اپنے نہیں' بلکہ خود حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ گرامی ہیں تو ان سے اختلاف یا تنقید کرنے کی جرأت کس مسلمان کو ہو سکتی ہے؟ اس سے ان تفسیری اقوال نے 'غیر متبدل دین' کی حیثیت اختیار کرلی۔ اب اگر کوئی علمی تحقیق یا سائنٹیفک انکشاف' ان اقوال میں سے کسی کے خلاف جاتا ہے' تو ہمارے ہاں عجیب صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ قدامت پسند طبقہ یا تو اس قسم کے مشاہداتی انکشافات ہی سے انکار کر دیتا ہے اور یا اس میں اور اپنے ہاں کے تفسیری اقوال میں مطابق پیدا کرنے کی بے معنی کوشش کرتا ہے۔ دوسری طرف' جب نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ دیکھتا ہے کہ جن باتوں کو ان کے سامنے اسلام کہہ کر پیش کیا جاتا ہے وہ علمی تحقیقات پر پوری نہیں اترتیں تو وہ اسلام ہی سے متنفر ہو جاتا اور سرکشی اختیار کر لیتا ہے۔ (مثلاً) حدیث کی مشہور کتاب ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ

کی ایک روایت میں ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

رسول اللہ نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک (۷۱) یا (۷۲) یا (۷۳) سال کی راہ ہے۔ اور سات آسمان ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اسی قدر ہے۔ ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے۔ اس کے اوپر سات پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھروں سے گھٹنوں تک اسی قدر فاصلہ ہے۔ ان بکروں کی پشت پر عرش ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے۔

آپ سوچئے کہ جب اس روایت کو کالج کے کسی طالب علم کے سامنے پیش کیا جائے ــــ اور پیش کیا جائے یہ کہہ کر کہ حضور نبی اکرمؐ نے ایسا فرمایا ہے ــــ تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ حالانکہ بات بالکل صاف ہے کہ یہ (اور اسی قسم کی دیگر روایات) رسول اللہ کے ارشادات ہو نہیں سکتے۔ یہ روایات وضعی ہیں ــــ اور یہ دعویٰ کوئی نیا نہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا ہے کہ تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصل نہیں۔ مغازی، ملاحم، اور تفسیر ــــ لیکن ہمارا قدامت پسند طبقہ ہے کہ زور دیئے جاتا ہے کہ ان تمام روایات کو رسول اللہ کے ارشادات تسلیم کرو۔ اور جس کی غیرتِ ایمانی اور ذاتِ رسالتمآبؐ کی عظمت کا احساس اُسے ایسا کرنے سے روکے، اسے منکرِ حدیث اور نہ جانے کیا کیا قرار دے کر حوالۂ دار و رسن کرنے کے فتوے صادر کر دیتا ہے۔

یہ ہے وہ خرابی جو اس قسم کے تفسیری اقوال کو یہ حیثیت دے دینے سے پیدا ہوتی ہے۔ جب تک ہم اپنے اس بنیادی نظریہ کی اصلاح نہیں کریں گے اس خرابی کے ازالہ کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکے گی اور ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ، اسلام سے برگشتہ ہوتا چلا جائے گا۔

اب رہے وہ حضرات جو سائنس کے کسی انکشاف یا علمی تحقیق کے نتیجہ اور اس قسم کے اقوال میں تطبیق کی کوشش کرتے ہیں تو وہ معاملہ کو اور بھی مضحکہ انگیز بنا دیتے ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں 'شق القمر' کا معجزہ مشہور ہے۔ (ہمیں حال ہی جو استفسارات موصول ہوئے ہیں اور جن کی طرف شروع میں اشارہ کیا گیا ہے ان میں سے بیشتر میں اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے) ہمارے زمانے میں 'سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب' کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام کو بڑے سائنٹیفک انداز سے پیش کرتے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تفسیر (تفہیم القرآن) میں اس بات سے تو انکار کیا ہے کہ یہ واقعہ حضور نبی اکرمؐ کے معجزہ کے طور پر ظہور میں آیا تھا۔ لیکن نفسِ واقعہ سے انکار نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ

تمام روایات کو جمع کرنے سے اس کی جو تفصیلات معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ ہجرت

سے تقریباً (۵) سال پہلے کا واقعہ ہے۔ قمری مہینے کی چودھویں شب تھی۔ چاند ابھی ابھی طلوع ہوا تھا۔ یکایک وہ پھٹا اور اس کا ایک ٹکڑا سامنے کی پہاڑی کے ایک طرف اور دوسرا ٹکڑا دوسری طرف نظر آیا۔ یہ کیفیت بس ایک ہی لحظہ رہی اور پھر دونوں ٹکڑے باہم جڑ گئے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ

معترضین اس پر دو طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ اول تو ان کے نزدیک ایسا ہونا ممکن ہی نہیں کہ چاند جیسے عظیم کرّے کے دو ٹکڑے پھٹ کر الگ ہو جائیں اور سینکڑوں میل کے فاصلے تک ایک دوسرے سے دور ہٹ جانے کے بعد پھر باہم جڑ جائیں۔ دوسرے وہ کہتے ہیں کہ اگر ایسا ہوتا تو یہ واقعہ دنیا بھر میں مشہور ہو جاتا۔ تاریخوں میں اس کا ذکر آتا۔ اور علم نجوم کی کتابوں میں اسے بیان کیا جاتا۔

ان اعتراضات کو سامنے لانے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ

درحقیقت یہ دونوں اعتراضات بے وزن ہیں۔ جہاں تک اس کے امکان کی بحث ہے قدیم زمانے میں تو شاید وہ چل بھی سکتی تھی۔ لیکن موجودہ دور میں ستاروں کی ساخت کے متعلق انسان کو جو معلومات حاصل ہوتی ہیں ان کی بنا پر یہ بات بالکل ممکن ہے کہ ایک کرہ اپنے اندر کی آتش فشانی کے باعث پھٹ جائے اور اس زبردست انفجار سے اس کے دو ٹکڑے دور تک چلے جائیں اور پھر اپنے مرکز کی مقناطیسی قوت کے سبب سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ آملیں۔

اس توجیہ کو اپنے عقیدت مندوں کے حلقہ میں پیش کر کے داد تحسین حاصل کر لینا تو آسان ہے لیکن آپ اسے دنیا کے بڑے بڑے سائنسدان تو ایک طرف، سائنس کے کسی عام طالب علم کے سامنے پیش کیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ اس کا کس طرح مذاق اڑاتا ہے۔ باقی رہا دوسرا اعتراض، تو اس کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

رہا دوسرا اعتراض تو وہ اس لئے بے وزن ہے کہ یہ واقعہ اچانک بس ایک لحظہ کے لئے پیش آیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس خاص لمحے میں دنیا بھر کی نگاہیں چاند کی طرف لگی ہوئی ہوں۔ اس سے کوئی دھماکا نہیں ہوا تھا کہ لوگوں کی توجہ اس کی طرف منعطف ہوتی۔ پہلے سے کوئی اطلاع اس کی نہ تھی کہ لوگ اس کے منتظر ہو کر آسمان کی طرف دیکھ رہے

ہوتے۔ پوری روئے زمین پر اسے دیکھا بھی نہیں جا سکتا تھا، بلکہ صرف عرب اور اس کے مشرقی جانب کے ممالک ہی میں اس وقت چاند نکلا ہوا تھا۔ تاریخ نگاری کا ذوق اور فن بھی اُس وقت تک اتنا ترقی یافتہ نہ تھا کہ مشرقی ممالک میں جن لوگوں نے اسے دیکھا ہوتا وہ اسے ثبت کر لیتے اور کسی مؤرخ کے پاس یہ شہادتیں جمع ہوتیں اور وہ تاریخ کی کسی کتاب میں ان کو درج کر لیتا۔ تاہم مالابار کی تاریخوں میں یہ ذکر آیا ہے کہ اس رات وہاں کے ایک راجہ نے یہ منظر دیکھا تھا۔ رہیں علم نجوم کی کتابیں اور جنتریاں تو ان میں اس کا ذکر آنا صرف اُس حالت میں ضروری تھا جبکہ چاند کی رفتار اور اس کی گردش کے راستے، اور اس کے طلوع و غروب کے اوقات میں اس سے کوئی فرق واقع ہوا ہوتا۔ یہ صورت چونکہ پیش نہیں آئی اس لئے قدیم زمانے کے اہلِ تنجیم کی توجہ اس کی طرف منعطف نہیں ہوئی۔ اُس زمانے میں رصد گاہیں اس حد تک ترقی یافتہ نہ تھیں کہ افلاک میں پیش آنے والے ہر واقعہ کا نوٹس لیتیں اور اس کو ریکارڈ پر محفوظ کر لیتیں۔

(ترجمان القرآن۔ بابت مئی ۱۹۶۵ء صفحہ ۱۵۱)

یہ ہے جو ہمارے ساتھ "مذہب اور سائنس" کی کشمکش کے سلسلہ میں ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم نے اپنے غلط نقطۂ نگاہ میں تبدیلی پیدا نہ کی تو اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو یورپ میں ہوا ہے۔ نقطۂ نگاہ میں تبدیلی سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم کے حقائق کو اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق سمجھا جائے اور کسی فرد یا کسی زمانے کے فہم قرآن کو حرفِ آخر اور قولِ فیصل قرار دیا جائے۔ باقی رہیں تفسیری روایات سو ان کے متعلق امام احمد بن حنبلؒ کا سا موقف اختیار کیا جائے۔ یعنی یہ کہا جائے کہ وہ وضعی روایات ہیں اور ان کی نسبت حضور نبی اکرمؐ کی طرف صحیح نہیں۔

(۱۰) یہ تو رہی ہماری غلط نگہی۔ دوسری طرف اہلِ مغرب کی کج نظری بھی کچھ کم تباہی کا موجب نہیں۔ ان کا نظریۂ زندگی یہ ہے کہ

(۱) یہ کائنات کسی نہ کسی طرح، وجود میں آگئی ہے اور طبیعی قوانینِ فطرت کی رُو سے از خود سرگرمِ عمل ہے۔ نہ اس کے پیچھے کوئی علیم و خبیر صاحبِ اختیار و ارادہ ہستی ہے اور نہ ہی اسکی تخلیق کا کوئی مقصد ہے۔

(۲) انسان بھی اسی کائنات کا ایک جزو ہے۔ اس لئے اس کی بھی تخلیق کا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ ہی اس کی کوئی منزل۔ اس کی زندگی بھی طبیعی قوانین کے تابع رہتی ہے۔ ان سے الگ اور بالاتر کوئی قوانین نہیں۔ موت سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور بس!

(۳) باقی رہی انسان کی تمدنی زندگی۔ سو اس کے لئے ہر قوم اپنے اپنے قوانین خود وضع کرے گی۔ ان قوانین کا بنیادی مقصد یہ ہوگا کہ وہ قوم کس طرح زیادہ سے زیادہ قوت حاصل کرکے، باقی اقوام پر غلبہ و تسلط حاصل کرسکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس نظریہ کے مطابق انسانی زندگی حیوانی سطح کی رہ جاتی ہے اور اس کا قانون "جنگل کا آئین" جس میں ہر بڑی قوت کا مالک حیوان، کمزوروں کو ہڑپ کر جاتا ہے۔ اب سوچئے کہ نظریۂ زندگی جو یہ اور مختلف قوموں میں حصولِ قوت کے لئے رسہ کشی (race) جاری ہو تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ وہی جس کی رُو سے آج یہ دنیا جہنم بن رہی ہے اور انسان اپنے ہی نہیں، خود اس کرۂ ارض کے مستقبل کے تصور سے سہمے چلا جاتا ہے جس نسبت سے انسان فطرت کی قوتوں کو مسخر کئے جاتا ہے اسی نسبت سے انسانی قلوب خوف و ہراس کا نشین بنتے چلے جاتے ہیں۔

اس نظریۂ زندگی کے خلاف قرآن کریم نے تسخیرِ کائنات کے لئے تاکید کے ساتھ، اس حقیقت کو بھی اتنی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ بیان کیا کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (۲۱/۱۶)۔ ہم نے اس ارض و سما، اس کارگہ کائنات، کو یونہی کھیل تماشے کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ اسے ایک عظیم مقصد کے لئے بالحق پیدا کیا ہے۔ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ۔ (۲۹/۴۴)۔ بالحق پیدا کرنے کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ (۴۵/۲۲)۔ یہ کہ ہر شخص کو اس کے کام کا پورا پورا بدلہ ملے اور کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہ ہو۔ دوسری جگہ ہے۔ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى (۵۳/۳۱) تاکہ جو غلط روش اختیار کرتا ہے اسے اس کے برے کاموں کا بدلہ ملے اور جو حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتا ہے اس کے اعمال کے خوشگوار نتائج اس کے سامنے آئیں۔ یعنی تخلیقِ ارض و سمٰوات کا ایک مقصد یہ ہے کہ انسان کا کوئی کام بلا نتیجہ نہ رہ جائے۔ خواہ وہ نتیجہ اس زندگی میں اس کے سامنے آجائے، یا مرنے کے بعد کی زندگی میں۔ یہ خوشگوار نتائج اسی صورت میں مرتب ہو سکتے ہیں جب انسان اپنی تمدنی زندگی کو وحیِ خداوندی کی عطا کردہ مستقل اقدار کے تابع رکھے ـــــ یہ اقدار اب قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ ان میں بنیادی قدر یہ ہے کہ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ۔ (۱۳/۱۷)۔ وہی نظریۂ زندگی، وہی نظامِ حیات، وہی قوت، وہی اقتدار بقا کا مستحق ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ یہی وہ نظریۂ زندگی ہے جس میں انسان ہر قسم کے خوف و حزن سے مامون رہ سکتا ہے۔ اس لئے کہ جب (قصۂ آدم کے تمثیلی بیان میں) آدم کے متعلق کہا تھا کہ اس میں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لینے کی صلاحیت

رکھ دی گئی ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۔ (۲/۳۸) جو خدا کی طرف سے عطا کردہ راہ نمائی کا اتباع کریگا، انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔

بنابریں، ہمارے سامنے تین گروہ آتے ہیں۔

(۱) جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے انہیں مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق نوعِ انسان کی منفعت کے لئے صرف کریں۔ انہیں جماعتِ مومنین کہا جائے گا۔

(۲) جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے، انہیں صرف اپنے اقتدار کی خاطر کام میں لائیں۔ یہ مغرب کی خدا فراموش قومیں ہیں۔ انہیں مقامِ مومن نصیب تو نہیں ہوسکا لیکن مقامِ آدم تک ضرور پہنچ گئی — اور پہنچ رہی — ہیں — اور

(۳) جو فطرت کی قوتوں کو مسخر ہی نہ کریں اور اپنی خوش فہمیوں کی دنیا میں مگن رہیں — انہیں مقامِ مومن تو کجا، مقامِ آدمیت بھی نصیب نہیں ہوسکتا۔ خسر الدنیا و الآخرۃ ۔ و ذالک ھو الخسران المبین — ان کے حصہ میں حال اور مستقبل دونوں کی تباہی آتی ہے۔

اب آپ خود سوچ لیجئے کہ ہمارا شمار کس زمرہ میں ہوتا ہے۔

(۰)

آخر میں ایک اور حقیقت کا سامنے لانا بھی خالی از دلچسپی نہیں ہوگا جس کی طرف قرآن کریم نے نہایت لطیف انداز میں اشارہ کیا ہے۔ انسان اس وقت تو بڑے فخر و ناز سے آسمانی کرّوں کی طرف پرواز کرتا اور وہاں کے حقائقِ مستور کو بڑے طرب و نشاط سے وا شگاف کرتا ہے۔ اسے سب سے زیادہ تلاش اس کی ہے کہ کسی کرّہ میں زندہ آبادی مل جائے۔ لیکن اگر ایسا ہوا کہ وہ آبادی اس سے زیادہ ارتقاء یافتہ ہوئی تو سوچئے کہ اس وقت انسان کی کیفیت کیا ہوگی؟ یہ اس لئے کہ قرآن کریم نے جہاں یہ کہا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ ۔ ہم نے بنی آدم کو واجب التکریم بنایا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ۔ (۱۷/۷۰) ہم نے انہیں (بنی آدم کو) اپنی مخلوق میں سے اکثر پر فضیلت دی ہے۔ "تمام مخلوق" پر نہیں، مخلوق میں سے اکثر پر۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کہیں ایسی مخلوق بھی ہے جو انسان سے افضل ہے۔ لہٰذا، ثریا پر پرواز اور کہکشاں گیر انسان کو ان کرّوں پر ذرا سنبھل کر قدم رکھنا چاہیئے اور آسمان کی بلندیوں تک پہنچنے کے بعد بھی اپنی خاک نشینی کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔

بابُ المراسلات

معراجِ نبویؐ

قارئین طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحبِ علم دوست اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ امریکہ کے خلانوردوں کی قمرپیمائی کی مہم سے بہت سے سوالات دل میں ابھر رہے تھے کہ اتنے میں لائل پور سے شائع ہونے والے اخبار المنبر کی ۲۵ جولائی تا یکم اگست کی اشاعت میں حسب ذیل شذرہ نظر سے گذرا۔

: انکار و تاویل ہی نہیں، شک و شبہ کا اظہار بھی غلط۔ بلاشبہ دو امریکی خلابازوں نے، چاند کی سطح پر چہل قدمی کی اور وہاں کی مٹی جھولیوں میں بھر کر واپس لوٹے۔ اگر اسے بیسویں صدی کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ بیسویں صدی کا کارنامہ اس لئے، کہ جہاں تک چاند تک کسی انسان کے "پہنچنے" یا اصطلاح عام میں چاند کو "مسخر کرنے" کا تعلق ہے یہ دونوں کارنامے اس واقعہ سے پونے چودہ سو سال پہلے انجام دیئے جا چکے ہیں۔ ایک مرتبہ تو ایک عظیم انسان" — جو سیّد الرسلؐ اور فخرِ اولادِ آدم بھی تھے اور سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی بھی — آپؐ نے اس زمین پر کھڑے، خالقِ شمس و قمر کے اذن سے، انگلی کے اشارے سے اس چاند کو دو ٹکڑے کر دیا تھا جس پر پہنچنے کے لئے ہزاروں برس سے انسانی ذہن بے تاب تھا۔ حضورِ سرورِ کونین (صلے اللہ علیہ وسلم) ہی کے وجودِ اقدس سے یہ عقدہ بھی حل ہوا کہ آپؐ بہ نفسِ نفیس اس خطۂ ارضی سے ایک برق رفتار سواری — براق — پر تمام ارضی کروں — جن میں چاند، مریخ، زہرہ، عطارد اور دوسرے سیارے شامل ہیں، شمسی سیاروں ہی نہیں، افلاک کے ساتوں مدارج طے کرتے ہوئے اس حریمِ قدس تک پہنچے جہاں کسی بھی مخلوق کی رسائی ممکن نہیں۔ حضور خاتم النبیین (علیہ التحیۃ والتسلیم) سے متعلق ان دونوں عظیم تر اعجازی واقعات ہی کا اثر تھا کہ حکمائے اسلام نے اپنے پاؤں تلے

کی زمین کے بارے میں معلومات و انکشافات پر قناعت نہیں کی، انہوں نے علم ہیئت اور علم الافلاک کے بارے میں بیش بہا معلومات حاصل کیں، رصدگاہیں تیار کیں، چاند سورج اور دوسرے سیاروں کی تقویمات مرتب کیں اور سورج و چاند کے گرہن تک کے بارے میں جدولیں تیار کیں۔

میں اس شذرہ پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا کیونکہ آپ کی نگاہ مجھ سے زیادہ ژرف ہیں اور حقیقت شناس ہے۔ اس میں مجھے ایک بات کھٹکی ہے اور اسے سامنے لانا ضروری سمجھتا ہوں۔ شق القمر اور معراج نبوی کے متعلق جو کچھ اس میں کہا گیا ہے وہ وہی ہے جو ہماری کتب روایات و تفاسیر میں چلا آرہا ہے اور جسے ہم اپنے واعظین کی زبانی اکثر سنتے رہتے ہیں۔ لیکن اس میں ان کروں کا نام تک لے دیا گیا ہے جن پر (انکے بیان کے مطابق) حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تھے ـــ یعنی چاند، مریخ، زہرہ، عطارد وغیرہ۔ جہاں تک میری ناقص معلومات کا تعلق ہے، کتب روایات میں ان کروں کا نام نہیں دیا گیا صرف "سات آسمان" کہا گیا ہے۔ اور ہر "آسمان" پر کسی نہ کسی پیغمبر سے ملاقات کا ذکر آتا ہے۔ اگر ان آسمانوں سے مراد چاند، مریخ، زہرہ، عطارد وغیرہ ہیں، تو ان پر حضورؐ کا بہ جسد عنصری تشریف لے جانا اور وہاں انبیائے سابقہ کا موجود ہونا، بہت سے سوالات پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن میں ان سوالات کا جواب آپ سے نہیں پوچھنا چاہتا۔ مجھے آپ کے موقف کا علم ہے۔ میری گزارش اور ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، طلوع اسلام میں ایک دفعہ معراج نبویؐ کے متعلق مودودی صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اگر آپ براہ کرم اس مضمون کو دوبارہ شائع کر دیں تو اس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ ہمارے ہاں کے عصر جدید کے مفسر حضرات اس باب میں کیا کہتے ہیں۔ شاید اس سے میرے ان سوالات کا جواب مل جائے اور میری طرح اور ایسے لوگ بھی اس سے استفادہ کر سکیں جن کے دل میں اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

(۰)

طلوع اسلام وہ مودودی صاحب کی وہ ریڈیو کی تقریر تھی جسے انہوں نے اپنے رسالہ ترجمان القرآن بابت اگست ۱۹۵۱ء میں شائع فرمایا تھا۔ اور بعد میں اسے طلوع اسلام میں بھی شائع کیا گیا تھا۔ اسے اب، زیر امتثال امر، درج ذیل کیا جاتا ہے۔

معراجِ نبویؐ

(سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہوئے بارہ سال گذر چکے تھے۔ ۵۲ برس کی عمر

تھی۔ حرم کعبہ میں سو رہے تھے۔ یکایک جبریلؑ فرشتے نے آکر آپ کو جگایا۔ نیم خفتہ و نیم بیدار حالت میں اٹھا کر آپؐ کو زمزم کے پاس لے گئے۔ سینہ چاک کیا اور زمزم کے پانی سے اس کو دھویا۔ پھر اسے علم اور بردباری اور دانائی اور ایمان و یقین سے بھر دیا۔ اس کے بعد آپؐ کی سواری کے لئے ایک جانور پیش کیا جس کا رنگ سفید اور قد خچر سے کچھ چھوٹا تھا۔ برق کی رفتار سے چلتا تھا اور اسی مناسبت سے اس کا نام "براق" تھا۔ پہلے انبیاءؑ بھی اس نوعیت کے سفر میں اسی سواری پر جایا کرتے تھے۔ جب آپؐ سوار ہونے لگے تو وہ چمکا۔ جبریلؑ نے تھپکی دے کر کہا۔ دیکھ کیا کرتا ہے۔ آج تک محمدؐ سے بڑی شخصیت کا کوئی انسان تجھ پر سوار نہیں ہوا ہے۔ پھر آپؐ اس پر سوار ہوئے اور جبریلؑ آپؐ کے ساتھ ساتھ چلے۔ پہلی منزل مدینہ کی تھی جہاں اتر کر آپؐ نے نماز پڑھی۔ جبریلؑ نے کہا۔ اس جگہ آپؐ ہجرت کر کے آئیں گے۔ دوسری منزل طورِ سینا کی تھی جہاں خدا حضرت موسیٰؑ سے ہم کلام ہوا۔ تیسری منزل بیت لحم کی تھی جہاں حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے۔ چوتھی منزل بیت المقدس تھا جہاں براق کا سفر ختم ہوا۔

اس سفر کے دوران میں ایک جگہ کسی پکارنے والے نے پکارا "ادھر آؤ"۔ آپؐ نے توجہ نہ دی۔ جبریلؑ نے بتایا۔ یہ یہودیت کی طرف بلا رہا تھا۔ دوسری طرف سے آواز آئی "ادھر آؤ"۔ آپؐ اس کی طرف بھی ملتفت نہ ہوئے۔ جبریلؑ نے کہا۔ یہ عیسائیت کا داعی تھا۔ پھر ایک عورت نہایت ہی سنوری نظر آئی اور اس نے اپنی طرف بلایا۔ آپؐ نے اس سے بھی نظر پھیر لی۔ جبریلؑ نے کہا یہ دنیا تھی۔ پھر ایک بوڑھی عورت سامنے آئی۔ جبریلؑ نے کہا۔ دنیا کی عمر کا اندازہ اس کی عمر سے کر لیجئے۔ پھر ایک شخص ملا جس نے آپؐ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ مگر آپ اسے بھی چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ جبریلؑ نے کہا۔ یہ شیطان تھا جو آپؐ کو راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔

بیت المقدس پہنچ کر آپؐ براق سے اتر گئے اور اسی مقام پر اسے باندھ دیا جہاں پہلے انبیاء اس کو باندھا کرتے تھے۔ ہیکل سلیمانی میں داخل ہوئے تو ان سب پیغمبروں کو موجود پایا جو ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک دنیا میں پیدا ہوئے تھے۔ آپؐ کے پہنچتے ہی نماز کے لئے صفیں بندھ گئیں۔ سب منتظر تھے کہ امامت کے لئے کون آگے بڑھتا ہے۔ جبریلؑ نے آپؐ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا دیا اور آپ نے سب کو نماز پڑھائی۔ پھر آپؐ کے سامنے تین پیالے پیش کئے گئے۔ ایک میں پانی۔ دوسرے میں دودھ۔ تیسرے میں شراب۔ آپ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا۔ جبریلؑ نے مبارک باد دی کہ آپؐ فطرت کی راہ پا گئے۔

اس کے بعد ایک سیڑھی آپ کے سامنے پیش کی گئی اور جبریلؑ اس کے ذریعے سے آپ کو آسمان کی طرف لے چلے۔ عربی زبان میں سیڑھی کو معراج کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے یہ سارا واقعہ معراج کے نام سے مشہور ہوا۔

پہلے آسمان پر پہنچے تو دروازہ بند تھا۔ محافظ فرشتوں نے پوچھا۔ کون آتا ہے۔ جبریلؑ نے اپنا نام بتایا۔ پوچھا۔ تمہارے ساتھ کون ہے؟ جبریلؑ نے کہا۔ محمدؐ۔ پوچھا کیا انہیں بلایا گیا ہے؟ کہا۔ ہاں! تب دروازہ کھلا۔ اور آپ کا پُر تپاک خیر مقدم کیا گیا۔ یہاں آپؐ کا تعارف فرشتوں اور انسانی ارواح کی ان بڑی بڑی شخصیتوں سے ہوا جو اس مرحلہ پر مقیم تھیں۔ ان میں نمایاں شخصیت ایک ایسے بزرگ کی تھی جو انسانی بناوٹ کا مکمل نمونہ تھے۔ چہرے مہرے اور جسم کی ساخت میں کسی پہلو سے کوئی نقص نہ تھا۔ جبریلؑ نے بتایا کہ یہ آدمؑ ہیں۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ۔ ان بزرگ کے دائیں بائیں بہت لوگ تھے۔ وہ دائیں جانب دیکھتے تو خوش ہوتے، اور بائیں جانب دیکھتے تو روتے۔ پوچھا۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ نسلِ آدمؑ ہے۔ آدم اپنی اولاد کے نیک لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور بُرے لوگوں کو دیکھ کر روتے ہیں۔

پھر آپؐ کو تفصیلی مشاہدہ کا موقع دیا گیا۔ ایک جگہ آپؐ نے دیکھا، کچھ لوگ کھیتی کاٹ رہے ہیں؛ اور جتنی کاٹتے جاتے ہیں اتنی ہی وہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ پوچھا۔ یہ کون ہیں؟ یہ خدا کی راہ میں جہاد کرنیوالے ہیں۔

پھر دیکھا۔ کچھ لوگ ہیں جن کے سر پتھروں سے کچلے جا رہے ہیں۔ پوچھا۔ یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ لوگ ہیں جن کی سرگرانی انہیں نماز کے لئے اٹھنے نہ دیتی تھی۔

کچھ اور لوگ دیکھے جن کے کپڑوں میں آگے اور پیچھے پیوند لگے ہوئے تھے اور وہ جانوروں کی طرح گھاس چر رہے تھے۔ پوچھا، یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ ہیں جو اپنے مال میں سے زکوٰۃ خیرات کچھ نہ دیتے تھے۔

پھر ایک شخص کو دیکھا کہ لکڑیوں کا گٹھا جمع کر کے اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور جب وہ نہیں اٹھتا تو اس میں کچھ اور لکڑیاں بڑھا لیتا تھا۔ پوچھا یہ کون احمق ہے؟ کہا گیا۔ یہ وہ شخص ہے جس پر امانتوں اور ذمہ داریوں کا اتنا بوجھ ہے کہ اُٹھا نہ سکتا تھا۔ مگر یہ ان کو کم کرنے کے بجائے اور زیادہ ذمہ داریوں کا بار اپنے اوپر لادے چلا جاتا تھا۔

پھر یہ دیکھا کہ کچھ لوگوں کی زبانیں اور ہونٹ قینچیوں سے کترے جا رہے ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ غیر ذمہ دار مقرر ہیں جو بے تکلف زبان چلاتے اور فتنہ برپا کیا کرتے تھے۔

ایک اور جگہ دیکھا کہ ایک پتھر میں ذرا سا شگاف ہوا اور اس سے ایک بڑا موٹا سا بیل نکل آیا۔ پھر وہ بیل اسی شگاف میں واپس جانے کی کوشش کرنے لگا مگر نہ جا سکا۔ پوچھا یہ کیا معاملہ ہے۔ کہا گیا یہ اس شخص کی مثال ہے جو غیر ذمہ داری کے ساتھ ایک فتنہ انگیز بات کر جاتا ہے۔ پھر نادم ہو کر اس کی تلافی کرنا چاہتا ہے۔ مگر نہیں کر سکتا۔

ایک اور مقام پر کچھ لوگ تھے جو اپنا گوشت کاٹ کاٹ کر کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ دوسروں

پر زبانِ طعن دراز کرتے تھے۔

انہی کے قریب کچھ اور لوگ تھے جن کے ناخن تانبے کے تھے۔ اور وہ اپنے منہ اور سینے نوچ رہے تھے۔ پوچھا۔ یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کے پیٹھ پیچھے ان کی برائیاں کرتے تھے اور ان کی عزت پر حملے کیا کرتے تھے۔

کچھ اور لوگ دیکھے جن کے ہونٹ اونٹوں کے مشابہ تھے اور وہ آگ کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا۔ یہ یتیموں کا مال ہضم کرتے تھے۔

پھر دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں جن کے پیٹ بے انتہا بڑے اور سانپوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ آنے جانے والے ان کو روندتے ہوئے گزرتے ہیں مگر وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے۔ پوچھا یہ کون ہیں۔ کہا گیا یہ سود خوار ہیں۔

پھر کچھ اور لوگ نظر آئے جن کے ایک جانب نفیس چکنا گوشت رکھا تھا اور دوسری جانب سڑا ہوا گوشت جس سے سخت بدبو آ رہی تھی۔ وہ اچھا گوشت چھوڑ کر سڑا ہوا گوشت کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا۔ یہ وہ مرد اور عورتیں ہیں جنہوں نے حلال بیویوں اور شوہروں کے ہوتے ہوئے حرام سے اپنی خواہش نفس پوری کی۔

پھر دیکھا کہ کچھ عورتیں اپنی چھاتیوں کے بل لٹک رہی ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا۔ یہ وہ عورتیں ہیں جنہوں نے اپنے شوہروں کے سرابیسے بچے منڈھ دیئے جو ان کے نہ تھے۔

انہی مشاہدات کے سلسلے میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ایک ایسے فرشتے سے ہوئی جو نہایت ترش روئی سے ملا۔ آپؐ نے جبریلؑ سے پوچھا۔ اب تک جتنے فرشتے ملے تھے سب خندہ پیشانی اور بشاش چہروں کے ساتھ ملے۔ ان حضرت کی خشک مزاجی کا کیا سبب ہے؟ جبریلؑ نے کہا۔ اس کے پاس ہنسی کا کیا کام، یہ تو دوزخ کا داروغہ ہے۔ یہ سنکر آپ نے دوزخ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے یکایک آپ کی نظر کے سامنے سے پردہ اٹھا دیا۔ اور دوزخ اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ نمودار ہو گئی۔

اس مرحلہ سے گزر کر آپ دوسرے آسمان پر پہنچے۔ یہاں کے اکابر میں دو نوجوان سب سے ممتاز تھے۔ تعارف پر معلوم ہوا یہ یحییٰؑ اور عیسیٰؑ ہیں۔

تیسرے آسمان پر آپ کا تعارف ایک بزرگ سے کرایا گیا جن کا حسن عام انسانوں کے مقابلے میں ایسا تھا جیسے تاروں کے مقابلہ میں چودھویں کا چاند۔ معلوم ہوا یہ یوسف علیہ السلام ہیں۔

چوتھے آسمان پر حضرت ادریسؑ، پانچویں پر حضرت ہارونؑ، چھٹے پر حضرت موسیٰؑ آپ سے ملے۔ ساتویں آسمان پر پہنچے تو ایک عظیم الشان محل (بیت المعمور) دیکھا جہاں بے شمار فرشتے آتے اور جاتے تھے۔ اسکے

بعد آپ کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے ہوئی جو خود آپ سے بہت مشابہ تھے۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

پھر مزید ارتقا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ گئے جو پیشگاہ رب العزت اور عالم خلق کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیچے سے جانے والے یہاں رُک جاتے ہیں اور اوپر سے احکام اور فرامین براہ راست یہاں آتے ہیں۔ اسی مقام کے قریب آپ کو جنت کا مشاہدہ کرایا گیا۔ اور آپ نے دیکھا کہ اللہ نے اپنے صالح بندوں کے لئے وہ کچھ مہیا کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی ذہن میں اس کا تصور تک گذر سکا۔

سدرۃ المنتہیٰ پر جبریلؑ ٹھہر گئے اور آپ تنہا آگے بڑھے۔ ایک بلند ہموار سطح پر پہنچے تو بارگاہِ جلال سامنے تھی۔ ہمکلامی کا شرف بخشا گیا۔ جو باتیں ارشاد ہوئیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) ہر روز پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔

(۲) سورۃ بقرہ کی آخری دو آیتیں تعلیم فرمائی گئیں۔

(۳) شرک کے سوا دوسرے سب گناہوں کی بخشش کا امکان ظاہر کیا گیا۔

(۴) ارشاد ہوا کہ جو شخص نیکی کا ارادہ کرتا ہے اس کے حق میں نیکی لکھی جاتی ہے اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ مگر جو برائی کا ارادہ کرتا ہے اس کے خلاف کچھ نہیں لکھا جاتا۔ اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے۔

پیشیٔ خداوندی سے واپسی پر نیچے اُترے تو حضرت موسیٰؑ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے رُوداد سن کر کہا۔ میں بنی اسرائیل کا تلخ تجربہ رکھتا ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ آپؐ کی امت پچاس نمازوں کی پابندی نہیں کر سکتی۔ جائیے اور کمی کے لئے عرض کیجئے۔ آپؐ گئے اور اللہ جل شانہٗ نے دس نمازیں کم کر دیں۔ پلٹے تو حضرت موسیٰؑ نے پھر وہی بات کہی۔ ان کے کہنے پر آپؐ بار بار اوپر جاتے رہے اور ہر بار دس نمازیں کم کی جاتی رہیں۔ آخر پانچ نمازوں کی فرضیت کا حکم ہوا۔ اور فرمایا گیا کہ یہی پچاس کے برابر ہیں۔

واپسی کے سفر میں آپؐ اسی سیڑھی سے اتر کر بیت المقدس آئے۔ یہاں پھر تمام پیغمبر موجود تھے۔ آپؐ نے ان کو نماز پڑھائی جو غالباً فجر کی نماز تھی۔ پھر براق پر سوار ہوئے اور مکہ واپس پہنچ گئے۔

[اس کے بعد اس تقریر میں کہا گیا ہے کہ صبح اٹھ کر آپؐ نے یہ واقعہ لوگوں کے سامنے بیان کیا تو "بہت سے مسلمان اس کو سن کر اسلام سے پھر گئے" اور مخالفین نے اس پر بہت سے اعتراضات کئے۔ آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کے سوال پر بیت المقدس کا نقشہ بھی بیان فرمایا۔ اس کے بعد تقریر

میں کہا گیا ہے۔]

اب لوگ آپؐ کے بیان کی صحت کا مزید ثبوت مانگنے لگے۔ فرمایا۔ جاتے ہوئے میں فلاں مقام پر فلاں قافلہ پر سے گزرا جس کے ساتھ یہ یہ سامان تھا۔ قافلے والوں کے اونٹ براق سے بھڑکے۔ ایک اونٹ فلاں وادی کی طرف بھاگ نکلا۔ میں نے قافلہ والوں کو اس کا پتہ بتایا۔ واپسی میں فلاں وادی میں فلاں قبیلہ کا قافلہ ملا۔ سب سو رہے تھے۔ میں نے ان کے برتن سے پانی پیا۔ اور اس بات کی علامت چھوڑ دی کہ اس سے پانی پیا گیا ہے۔ ایسے ہی کچھ اور نشانے پتے آپؐ نے دیئے اور بعد میں آنے والے قافلوں سے ان کی تصدیق ہوئی۔ اس طرح زبانیں بند ہو گئیں مگر دل یہی سوچتے رہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آج بھی بہت سے لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ کیسے ہوا؟

———— (باقی) ————

طلوعِ اسلام کالج

کالج کی زمین خریدنے کیلئے احباب نے جس فراخدلی اور خندہ پیشانی سے عطیات دیئے ہیں اس کیلئے قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی انکی بدل ممنون ہے۔ ایک کنال اراضی کی قیمت کا اندازہ -/۲۵۰۰ روپے لگایا گیا تھا اور اس وقت تک چالیس سے زائد احباب نے ایک ایک کنال کیلئے عطیات ادا کر دیئے ہیں اور انکے عوض قریب اتنی ہی اراضی خریدی جا چکی ہے لیکن ابھی مزید اراضی کی ضرورت ہے اس کے لئے ہم جملہ صاحب استطاعت احباب سے درخواست کرینگے کہ وہ اپنے عطیات سے ہمیں جلدی نوازیں کیونکہ کل اراضی کا ایک ہی جگہ ہونا نہایت ضروری ہے۔ اگر بقیہ اراضی فی الفور خریدی نہ جا سکی تو کالج کے پروگرام پر بڑا مضر رساں اثر پڑیگا۔

(۲) اراضی کے بعد عمارات کی تعمیر کا سوال سامنے آئیگا۔ جیسا کہ پہلے اعلان کیا جا چکا ہے اس سلسلہ میں مختلف احباب نے چند ایک کمرے بنا دینے کا ذمہ لیا ہے لیکن ان کے علاوہ مزید کمروں کی بھی ضرورت ہو گی اور (DEVELOPMENT) کے اخراجات اس پر مستزاد ہونگے۔ چونکہ ارادہ یہ ہے کہ آئندہ سال سے سالِ اوّل (انٹرمیڈیٹ) کی تعلیم شروع کر دی جائے اسلئے ان اخراجات کے لئے بھی روپیہ بہت جلد درکار ہے۔ اس سلسلہ میں بھی احباب سے درخواست ہے کہ وہ عطیات کی ادائیگی میں توقف نہ فرمائیں۔ یہ احباب جتنی دیر کرینگے کالج کا پروگرام اتنا ہی پیچھے چلا جائے گا اور ہمارے کتنے بچے اسکے فوائد سے محروم رہ جائینگے۔

(۳) طلوعِ اسلام کنونشن کے موقعہ پر کالج کمیٹی کی رپورٹ اور معطیان کی مکمل فہرست پیش خدمت کر دی جائیگی۔ اس اسکیم کے تعارف کے لئے پمفلٹ چھپ کر تیار ہو گیا ہے وہ طلوعِ اسلام کی بزموں کو کافی تعداد میں بھیجا جا رہا ہے۔ انکے علاوہ جن دیگر حضرات کو فنڈ جمع کرنے کے سلسلہ میں پمفلٹ درکار ہوں وہ راقم الحروف کو اطلاع فرما دیں۔ والسلام!

(شیخ) سراج الحق سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔ ۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

اسلام کیا ہے؟

کسی قوم کی اس سے بڑھ کر بدقسمتی کوئی اور بھی ہو سکتی ہے کہ وہ مسلمان کہلائے لیکن یہ نہ بتا سکے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ وہ صبح سے شام تک، سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں بار اسلام کا لفظ دہرائے لیکن یہ متعین نہ کر سکے کہ اسلام ہے کیا؟ کسی غیر قوم کے کانوں تک یہ بات پہنچا دیتے تو وہ اسے باور ہی نہ کرے۔ اور اگر اسے واقعات کی شہادت سے باور کرا بھی دیا جائے تو اس کے بعد وہ جو کچھ ہمارے متعلق کہے گی، ناگفتہ بہتر ہے۔ ۱۹۵۳ء کے ہنگاموں کے بعد منیر کمیٹی نے (ملک کے عوام سے نہیں) حضرات علمائے کرام سے کہا کہ یہ بتائیے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں، تو بہت سوں نے اس سوال کا جواب ہی نہ دیا، اور جنہوں نے جواب دیا، ان میں سے کسی ایک کا جواب دوسرے سے نہ ملا۔ اب سولہ سال کے بعد، ملک میں یہ سوال عام ہو رہا ہے کہ اسلام کیا ہے۔ اس سوال کی ضرورت اس لئے پیش آ رہی ہے کہ اس بات کا فیصلہ کیا جانا مطلوب ہے کہ فلاں شخص کا فلاں نظریہ، عقیدہ، یا عمل اسلام کے مطابق ہے یا اس کے خلاف۔ اس سوال کے جواب میں جو بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں ان سے پھر ۱۹۵۳ء میں، علمائے کرام کے جوابات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس باب میں مثالیں تو اتنی پیش کی جا سکتی ہیں کہ آپ کو ان کے پڑھنے کے لئے وقت ہی نہ ملے۔ لیکن ہم اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے، یہاں دو چار پر اکتفا کریں گے۔ انہی دو چار دانوں سے آپ دیگ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اگست ۱۹۶۹ء کے ماہنامہ میثاق (لاہور) میں، ڈاکٹر محمد رفیع الدین۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی لٹ، کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "مجوزہ تعلیمی پالیسی"۔ یہ درحقیقت تبصرہ ہے حکومت کی طرف سے حال ہی میں شائع کردہ تعلیمی پالیسی پر۔ اس سلسلہ میں وہ ملک و ملت کے لئے اسلام کی بنیادی حیثیت و اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اب تک، اسلام کو پاکستانی ریاست کے تمام اعمال و افعال، بالخصوص تعلیم کی روح بنانے کے راستہ میں جن فرضی رکاوٹوں کا ذکر کیا جاتا رہا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی کو معلوم ہی

نہیں کہ اسلام ہے کیا۔ اب تک اسلام کی وضاحت کوئی نہیں کر سکا۔ آخر ہم کس اسلام کو جامہ عمل پہنائیں اور دوسری یہ کہ اسلام میں کئی فرقے ہیں اگر اسلام یہاں لایا گیا تو وہ کس فرقے کا اسلام ہوگا۔

اعتراضات آپ نے دیکھ لئے ۔اب پہلے' ان پر تنقید ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں ۔

یہ دونوں اعتراضات قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد ہیں ۔ یہ یا تو ان لوگوں کے توہمات ہیں جو اسلام سے ناواقف ہیں اور جن کی تربیت ایسے بے دین' بے علم اور دہریت پسند ماحول میں ہوئی ہے کہ ان کو موقعہ ہی نہیں مل سکا کہ وہ اسلام کو جان سکیں یا سمجھ سکیں ۔ یا یہ ان لوگوں کے بہانے ہیں جو اپنی سفلی اور حیوانی خواہشات میں اس قدر غرق ہیں کہ اسلام کے مرد آزما اور مرد آفریں اخلاقی ضابطے کو اپنے آپ پر عاید نہیں کر سکتے اور اسلام کی آمد کے خیال سے کانپ جاتے ہیں ۔ یا یہ ان لوگوں کی چالیں ہیں جو دوسرے ازموں کے پراپگنڈہ کا شکار ہو چکے ہیں اور دل ہی دل میں ان کے فروغ کے متمنی ہیں اتحاپھر یہ ان مغربی دانش وروں کا گمراہ کن پراپگنڈہ ہے جو ڈرتے ہیں کہ اگر اسلام ایک سیاسی، علمی اور اخلاقی قوت کی حیثیت سے پھر دنیا میں ابھر آیا تو ان کی بے خدا تہذیب ان کے سامنے مٹ کر رہے گی۔

اس کے بعد ارشاد ہے ۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام ایک ایسا سیدھا سادہ صاف اور واضح دین ہے کہ اس کی بنیادی تعلیمات کے بارہ میں کوئی دیانت دار اور واقف حال انسان کسی شک یا الجھن میں نہیں رہ سکتا۔ اور اسلام میں کوئی ایسے فرقے موجود نہیں جو اسلام کی ضروری اور بنیادی باتوں میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہوں۔ (صـ)

کتنی بڑی نوید جانفزا ہے یہ بشیر دلنواز کہ ڈاکٹر صاحب نے اسلام کا ایک ایسا مفہوم پا لیا ہے جس میں کسی کو کوئی شک یا الجھن نہیں ہو سکتی' اور جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ یقیناً آپ یہ معلوم کرنے کے لئے بے تاب ہوں گے کہ اسلام کا وہ مفہوم کیا ہے۔ ہم آپ کو زیادہ دیر تک زحمت کش انتظار نہیں کرنا چاہتے ۔ وہ مفہوم ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے ۔

ان دنوں بعض لوگ اسلامی اصولوں کے نفاذ کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اسلام کا سب سے بڑا اور بنیادی اصول' خدا کی محبت اور عبادت ہے ۔ یعنی یہ کہ انسان خدا سے محبت کرے ۔ خدا کی ستائش کرے اور اپنے تمام اعمال و افعال کو خدا کی محبت کے تابع بنائے ۔ کلمہ توحید اسی اصول کا بیان ہے۔

یہ اصول، اسلام کی ابتدا اور انتہا رہے۔ اس کے بغیر اسلام کی کوئی ہلکی سی ابتدا بھی ممکن نہیں

اسلام کے اور تمام اصول اسی اصول سے نکلے ہیں اور اسی پر مبنی ہیں۔

آپ نے ملاحظہ فرمالیا اسلام کا بنیادی اصول! کیا اس کے بعد اس امر کے فیصلہ کرنے میں کسی کو کوئی دقت پیش آسکتی ہے کہ فلاں شخص کا فلاں نظریہ، عقیدہ یا عمل، اسلام کے خلاف ہے یا نہیں؟

اب رہا اس اصول کا متفق علیہ ہونا سو میثاق کی زیر نظر اشاعت کے ساتھ ہی مجلہ ایشیا کا ۷ اگست کا شمارہ سامنے آیا ہے۔ اس میں ایک صاحب نے مودودی صاحب سے کہا۔

انسان کا رشتہ اللہ تعالےٰ سے ہرگز خوف پر مبنی نہیں ہو سکتا --- یہ نظریہ ایک پاکستانی مفکر کا ہے۔ آپ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟

اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا۔

یہ نظریہ قرآن و حدیث دونوں سے ٹکراتا ہے۔ قرآن و حدیث میں متعدد مقامات پر کہا گیا ہے کہ خدا سے ڈرو بھی اور اس سے محبت بھی کرو۔ ڈر، خوف، طمع اور محبت یہ سب انسان کے فطری جذبات ہیں اور عملی زندگی میں انسان ہر وقت ان کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے انسان کو راہ راست پر رکھنے کے لئے ان فطری جذبات کا مرجع اپنی ذات کو قرار دیا ہے تاکہ انسان کے ان جذبات میں اعتدال و توازن قائم رہے اور یہی جذبات اس کے لئے نیکی و بھلائی کے فروغ کا ذریعہ ثابت ہوں۔ مثلاً یہ فرمایا گیا ہے کہ اپنے رب سے ڈرو۔ جو شخص اپنے رب سے ڈرے گا، وہ ساری دنیا کا خوف اپنے دل سے نکال دے گا۔ اور دنیا کی کوئی طاقت بھی اسے حق پرستی سے باز نہ رکھ سکیگی۔ اس کے برعکس اگر وہ بندوں سے ڈریگا تو ان کے ڈر سے بہت سے بھلائی کے کاموں کو بھی چھوڑ بیٹھے گا۔ اسی طرح فرمایا کہ طمع اپنے خدا سے ہونا چاہیئے۔ یعنی دنیا میں کسی اور سے لالچ نہ رکھو۔ لالچ تمہیں صرف اپنے خدا سے رکھنی چاہیئے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص خدا سے لالچ رکھے گا وہ کبھی بُرے کاموں میں اپنی جان اور مال نہیں کھپا سکتا۔ نیک کاموں میں ہی انہیں صرف کرے گا۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ سے محبت کا جذبہ بھی انسان کو راہ راست سے بھٹکنے نہیں دیتا۔ جو مفکر صاحب یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ انسان کا اللہ تعالےٰ سے رشتہ ہرگز خوف پر مبنی نہیں ہو سکتا، وہ بے سوچے سمجھے ایک بات کہتے ہیں۔

یعنی ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کے نزدیک، اسلام کا بنیادی اصول، خدا سے محبت اور صرف محبت ہے۔ لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ نظریہ قرآن اور حدیث دونوں سے ٹکراتا ہے۔ اسلام کا بنیادی اصول، خدا سے

خوف اور محبت دونوں ہیں۔

اب یہ بات ڈاکٹر صاحب موصوف اور مودودی صاحب کے طے کرنے کی ہے کہ ان میں سے کس کا نظریہ اسلام کے مطابق ہے اور کس کا اس کے خلاف۔

(۰)

اس کے بعد ہمارے سامنے جماعت اسلامی کے نظریات کا ترجمان ماہنامہ چراغ راہ (کراچی) کا اگست کا شمارہ آتا ہے۔ مودودی صاحب نے اپنے متعلق کہہ رکھا ہے کہ وہ نہ قدامت پرست طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں نہ جدت پسند سے۔ وہ بیچ کی راس کے آدمی ہیں۔ اس بنا پر جماعت اسلامی کے نقیبا کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ وہ قدامت پرست طبقہ میں بھی کیڑے ڈالتے رہتے ہیں اور جدت پسندوں میں بھی، تاکہ اس سے "بیچ کی راس" کے آدمی کی اہمیت نمایاں ہو جائے۔ مذکورہ بالا ماہنامہ چراغ راہ کے افتتاحیہ میں بھی یہی موقف اختیار کیا گیا ہے۔ پہلے قدامت پرستوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ

> کیا ایسے لوگ ہمارے معاشرہ کا کوئی موثر طبقہ ہیں اور کیا وہ عوام کے اندر اتنے اثر و رسوخ کے مالک ہیں کہ لوگوں کو اسلام کو حقیقی معنوں میں اختیار کرنے سے روک سکیں؟ کیا لوگ ان کے پیچھے چل رہے ہیں۔

اس طبقہ کے اسلام اور ان کی حیثیت کو یوں ختم کرنے کے بعد چراغ راہ جدت پسند طبقہ پر برسا ہے اور اسے اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیکر لکھتا ہے۔

> اس کشمکش کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ مغرب زدہ طبقہ اپنی روش پر نظر ثانی کرے اور امت کی مجموعی رائے کے مقابلے میں اپنی قلیل اقلیت کی رائے پر اصرار نہ کرے اور حقیقی اسلام کی صورت کو مسخ کرنے کی روش ترک کر دے۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کر لے کہ یہ امت اگر دینی و دنیاوی ترقی سے بہرہ یاب ہو سکتی ہے تو حقیقی اور بے آمیز اسلام کے سائے تلے ہی ہو سکتی ہے۔ اس کو اس راہ پر آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش اس کے ساتھ ایک بدخواہی ہے۔ امت مسلمہ ہر اس شخص کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کرنے پر تیار ہے جو اس کے معاشرے کے بگاڑ کو دور کر کے اسے دین کی حقیقی شاہراہ پر چلا دے۔ وہ ان ہی لوگوں کی راہنمائی دل سے تسلیم کر سکتی ہے جن کے بارے میں اسے یہ اعتماد ہو کہ وہ دین کے معاملے میں مخلص ہیں اور ان کا کوئی قدم خدا اور رسول کی منشا کے خلاف نہ اٹھیگا۔

یعنی ان کے نزدیک حقیقی اور بے آمیز اسلام امت کی مجموعی رائے کا نام ہے۔ یہ وہی امت ہے جسے مودودی صاحب

"چڑیا گھر کے جانور" قرار دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ ان میں کے (۹۹۹) فی ہزار اسلام کی الف۔ ب تک سے نا آشنا ہیں اور ان کی مجموعی رائے کے مطابق جو حکومت قائم ہوگی وہ "مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔"[1]

لیکن چراغِ راہ کے مقالہ کی رو سے 'ان کی مجموعی رائے' بھی اسلام میں سند کا درجہ نہیں رکھے گی' اسلئے کہ یہ خود دوسروں کی راہ نمائی کے محتاج ہونگے۔ لہٰذا سند و حجت ان لوگوں کا اسلام ہوگا' جن کی راہ نمائی یہ لوگ دل سے تسلیم کرینگے۔ اور یہ' دل سے راہ نمائی انہی کی تسلیم کرینگے

جن کے بارے میں انہیں یہ اعتماد ہو کہ وہ دین کے معاملہ میں مخلص ہیں اور ان کا کوئی قدم خدا اور رسولؐ کی منشاء کے خلاف نہ اٹھیگا۔

اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے لوگ 'جماعتِ اسلامی کے "صالحین" کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا' ان حضرات کے نزدیک' اسلام نام ہوا جماعتِ اسلامی کے اتباع کا۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسلام کی صحیح تعبیر علمائے کرام کے ہاں سے مل سکتی ہے لیکن جماعت اسلامی کا علما کے بارے میں بھی عجیب مسلک ہے۔ جب علماء حضرات ان کی مخالفت کرتے ہیں تو یہ انہیں من حیث الجماعت مطرود قرار دیتے ہیں۔ ۱۹۴۳ء کی بات ہے۔ علامہ موسیٰ جار اللہ مرحوم نے' مودودی صاحب کے نام ایک خط میں ہندوستان کے علماء کی حالت کے خلاف شکایت کی۔ انہوں نے اس کے جواب میں فرمایا کہ :

> علامہ نے ان سطور میں علمائے ہند کی نسبت جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس کا حرف حرف صحیح ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ ملامت و تحقیر کے وہ سزاوار ہیں۔ لیکن نہایت ادب کے ساتھ ہم اتنی گزارش ضرور کرینگے کہ ان جرائم کے مجرم تنہا ہندوستان ہی کے علماء نہیں ہیں بلکہ اس باب میں تمام عالم اسلامی کے علماء کا حال یکساں ہے ...... ہر جگہ کے علماء اپنے انجام کو پہنچ گئے ہیں) اور قدرت کی طرف سے ان جرائم کی جو سزا مقرر تھی وہ ان کو مل چکی ہے۔[2]
>
> (ترجمان القرآن جنوری، فروری ۱۹۴۵ء)

لیکن جب یہی علماء کسی بات میں ان کے ہم نوا ہوتے ہیں تو ان کا قول اسلام میں سند قرار پا جاتا ہے (مثلاً) پاکستان ٹائمز کی اشاعت بابت ۱۴ راگست ۱۹۶۷ء (یوم آزادی نمبر) میں مودودی صاحب کا ایک مقالہ

---

[1] ملاحظہ ہو اسی پرچہ میں شائع شدہ "حقائق و عبر"

[2] تفصیل کے لئے دیکھئے۔ طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۶۹ء۔ مقالہ "جماعت اسلامی اور علماء"

شائع ہوا ہے جس کے عنوان کا ترجمہ ہے "ایک پاکستانی کے نزدیک آزادی کا مفہوم کیا ہے"۔ اس میں وہ ان قوانین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جن کی مخالفت مودودی صاحب نے کی تھی، لکھتے ہیں:

> پاکستان کے مسلمان حکمرانوں نے علماء کے متفقہ فتوے کے علی الرغم اسلامی قوانین میں ترمیم و تنسیخ اور تغیر و تبدل کر دیا۔

—— (۱) ——

میثاق اور المنبر (لائل پور) دونوں، کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو ۱۹۵۷ء میں اٹھارہ برس کے بعد جماعتِ اسلامی کے راہ گم کردہ قافلے" سے الگ ہوئے تھے۔ میثاق کا نظریہ اسلام ہم دیکھ چکے ہیں، اب المنبر کی تشریحات ملاحظہ فرمائیے۔ اس نے اپنی اشاعت بابت ۲۵ جولائی تا یکم اگست کے صفحہ اول پر صدرِ مملکت کے اس اعلان پر ہدیہ تبریک پیش کیا ہے کہ "اگر کوئی گروہ یا جماعت اسلام کے بنیادی اصولوں اور پاکستان کی سالمیت کے منافی کوئی بات پھیلائے گی یا چاہے عوام کے اتحاد و استحکام میں رخنے ڈالنے کی کوشش کرے گی تو وہ عوام اور ان کی مسلح افواج کے غیظ و غضب کو دعوت دے گی"۔ اس کے بعد اس نے لکھا ہے کہ اتنے عظیم کارنامے کو انجام دینا اگرچہ صدرِ مملکت کی ذمہ داری ہے تاہم ہر پاکستانی مسلمان پر بھی یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ اس اہم کام میں صدرِ مملکت کا ہاتھ بٹائے"۔ اس کے بعد اس نے لکھا ہے۔

> "اس سلسلے میں سب سے پہلا تعاون یہ ہے کہ ان کوششوں کی نشاندہی کی جائے جو پاکستان میں اسلام کے بنیادی اصولوں کے منافی مسلسل جاری ہیں اور جن سے ایک طرف مملکتِ عزیز کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہے اور دوسری جانب پاکستانی عوام کا اتحاد پارہ پارہ ہو رہا ہے، اور وہ ذہنی انتشار میں مبتلا ہو رہے ہیں —— اس تعاون ہی کے جذبے سے ہم عرض کریں گے کہ سب سے زیادہ شر انگیز حرکتیں جو پچھلے بائیس برس سے خلافِ اسلام و پاکستان ہو رہی ہیں، ان میں سے چند حسبِ ذیل ہیں۔

اور وہ شر انگیز حرکتیں، المنبر کے الفاظ میں یہ ہیں۔

> (۱) اب تک اسلام، اسلام کا شور مچایا گیا، اور متعدد ادارے بھی اس مقصد کے لئے قائم کئے گئے کہ یہاں اسلام کو فروغ حاصل ہو، مگر عملاً ہوا یہ کہ "اسلام" ہی کو اپنی غلط زندگی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی گئی اور اسلام کا ایک ایسا ایڈیشن تیار کرنے کی کوشش کی گئی جو مغربی زندگی کی تمام ملعون عادتوں کو سندِ جواز مہیا کرے، بالفاظِ واضح اسلام میں تحریف و ترمیم

کے دروازے کھولے گئے اور اسلام کے "مغربی ایڈیشن" کی تیاری کے لئے ہاتھ پاؤں مارے گئے۔

(۲) ثقافت کے نام پر اسلامی قدروں کو ملیامیٹ کرنے کی پوری پوری کوشش ہوئی۔ اور جن امور کو اسلام نے غیر مبہم انداز میں خدا کے غضب کو بھڑکانے کا باعث بتایا تھا، ثقافت کے نام پر ان سب کو عام کیا گیا۔ عریانی۔ بے حجابی۔ رقص۔ سرود۔ مرد و زن کا اختلاط اور پھر ان محفلوں میں شراب نوشی اور دوسرے محرکات کا ارتکاب عام ہوا۔

(۳) اسلام کے ساتھ بعض دوسرے ازموں کو گڈمڈ کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور بات "اسلامی سوشلزم" خالص سوشلزم اور پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانے کی مساعی تک پہنچی۔

(۴) اس مقصد کے حصول کے لئے صوبائی عصبیتوں کو ابھارا گیا۔ طبقاتی نزاع کو ہوا دے کر باہمی تصادم کی تحریکات چلائی گئیں۔ اور اسلامی مشاہیر کے بالمقابل غیر مسلم مشاہیر ملحدانہ تحریکات و نظریات کے علمبردار غیر ملکی راہ نماؤں کی تصاویر کو پوجا جانے لگا اور فخر و مباہات سے ان کی تصویروں کے بیج سینوں پر آراستہ کئے گئے۔

(۵) حضور خاتم النبیین علیہ التحیۃ والتسلیم کی ذات اقدس جو اس امت کے لئے واحد مرکزی حیثیت اور نکتہ اتحاد ہے آپ سے رشتہ اخلاص کمزور کرنے کے لئے بعض اشخاص کو بحیثیت نبی و رسول کے پیش کیا گیا اور ببانگ دہل کہا گیا کہ اگر ان پر ایمان نہ لایا گیا تو حضورؐ پر ایمان سے نجات حاصل نہ ہو سکیگی۔

ان تفصیلات کو بیان کرنے کے بعد المدابر نے کہا ہے۔

یہ اور اس قسم کی تخریبی مساعی ہیں جو اسلام اور پاکستان کی سالمیت کے خلاف مسلسل جاری ہیں، اور جن کی وجہ سے ملتِ اسلامیہ پاکستان انتشار اور باہمی تصادم میں مبتلا ہے۔ اگر صدر مملکت اپنے عظیم اور دو ٹوک اعلان کے مطابق ان سرگرمیوں کا سدباب کر سکیں تو اسلام کی اس عظمت کو بحال کرنے کے راستے کھل جائیں گے جن کی بحالی کو آپ نے ۲۵ مارچ کے انقلاب کا سب سے بڑا مقصد قرار دیا تھا۔ اللہ تعالےٰ صدر مملکت کو اس عظیم کارنامہ کے انجام دینے کی توفیق سے نوازیں۔ آمین! یا رب العالمین!!

——— (۵) ———

یہ رہا مذہب پرست طبقہ۔ جہاں تک "مسٹروں" کا تعلق ہے ان کی کیفیت ان سے بھی عجیب تر ہے۔

پاکستان ٹائمز کی ۱۴ اگست ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں ڈاکٹر جاوید اقبال (خلف الرشید علامہ اقبالؒ) کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "آئیڈیالوجی آف پاکستان"۔ اس میں وہ رقمطراز ہیں۔

> پاکستان کی اسلامی مملکت ایک مثالی سیکولر مملکت کی تمام خصوصیات کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے، ان معنوں میں کہ پاکستان میں "خالص مذہب" شخصی معاملہ (PERSONAL AFFAIR) ہے، اور مملکت اپنے تمام شہریوں ــــ سنی۔ شیعہ۔ وہابی اور اسلام کے دیگر فرقوں ــــ کی مادی ترقی اور فلاح و بہبود کی ذمہ دار ہے۔

اس کے برعکس مودودی صاحب ایک ایسی مملکت کو جس میں مذہب افراد کا شخصی معاملہ قرار پائے "مسلمانوں کی کافرانہ حکومت" قرار دیتے ہیں۔

(۰)

یہ ہیں اسلام کے وہ چند بنیادی اصول و مفاہیم جو پچھلے چند دنوں میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ آپ ان پر غور کیجئے اور سوچئے کہ کیا اس سے اسلام کا کوئی متفق علیہ مفہوم سامنے آتا ہے؟ اور ابھی ہم نے اس اسلام کا ذکر ہی نہیں کیا جو مختلف فرقوں کے نزدیک "حقیقی اسلام" ہے۔ ان حالات میں یہی کہا جائے گا، کہ خیریت اسی میں ہے کہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہے اسے خاموشی سے مسلمان تصور کر لیا جائے۔ لیکن یہ "خیریت" تو اسی وقت تک ہے جب تک ہمارے ہاں کے اسلام کے اجارہ دار حضرات کے ہاتھ میں اقتدار نہیں آتا۔ اگر اقتدار ان کے ہاتھ میں آجائے تو پھر یہ خیریت بھی ختم ہو جائے گی۔ اس لئے کہ جماعت اسلامی کے نزدیک، نہ کوئی پیدائشی مسلمان، مسلمان قرار پا سکتا ہے اور نہ ہی کسی شخص کو محض اس بنا پر مسلمان تصور کر لیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ مودودی صاحب نے واضح الفاظ میں کہہ رکھا ہے کہ

> جماعت اسلامی میں کوئی شخص محض اس مفروضہ پر شامل نہیں ہو سکتا کہ جب وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے تو وہ ضرور مسلمان ہوگا۔
>
> (ترجمان القرآن۔ بابت محرم ۱۳۶۰ھ)

چنانچہ جب انہوں نے پہلے پہل اس جماعت کی تشکیل کی ہے تو انہوں نے اس میں شامل ہونے والوں کی، اپنے ہاتھ پر تجدید ایمان کی تھی۔ لہٰذا ان کے نزدیک نہ کسی کا مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونا اسے مسلمان تصور کرا سکیگا اور نہ ہی اس کا یہ کہنا کہ وہ مسلمان ہے۔ انہیں ان جیسا اسلام لاکر مسلمان ہونا پڑے گا، ورنہ ایک سال کے نوٹس کے بعد انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے طلوعِ اسلام۔ بابت جولائی ۱۹۶۹ء کے ملحوظات) مودودی صاحب غالباً ابھی سے ان لوگوں کی فہرستیں مرتب فرما رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے مقالہ،

(مطبوعہ پاکستان ٹائمز۔ ۱۴ راگست) کے آخری پیرا میں لکھتے ہیں۔

> یہ چیز ہمارے چہروں پر جلی حروف میں لکھی ملتی ہے کہ یہاں ایک ایسی قوم ہے جو انگریزوں کو ملک سے نکال دینے کے بعد اور بھی زیادہ انگریز بننے کے لئے بے تاب ہے۔ اگر (ان میں سے) کوئی انگریز نہیں بن سکا تو وہ امریکن یا روسی یا چینی بننے کی کوشش کر رہا ہے مسلمان بننے یا بننے کا وہ قطعاً خواہشمند نہیں۔ اتنا ہی نہیں۔ ہماری پیشانیوں پر یہ بھی لکھا ملتا ہے کہ یہاں ایک ایسی قوم بھی ہے جو اپنے انگریز آقاؤں کے چلے جانے سے خوش نہیں۔ یہ کچھ مبالغہ آمیز سی بات نظر آئے گی لیکن ہے یہ حقیقت۔ اسلئے کہ ہم انگریزی بولنا، انگریزوں کی طرح رہنا سہنا، انگریزوں کے مسلط کردہ نظام تعلیم کو باقی رکھنا اور اپنے معاملات کو انگریزوں کے انداز کے مطابق طے کرنا پسند کرتے ہیں۔ مختصراً، ہم اس بات کے لئے قطعاً تیار نہیں کہ جو چیز انگریزوں سے متعلق ہے اسے خیرباد کہہ کر اپنے اس انداز زیست اور کلچر کا احیاء کریں جس کا تصور اسلام نے دیا ہے۔

اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، پاکستان میں اسلام کوئی نجی عقیدہ یا شخصی معاملہ نہیں رہا کہ اس کا جو تصور کسی کو پسند آئے وہ اسے اختیار کرلے۔ اس نے یہاں مملکت کے بنیادی نظریہ کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے ——— کم از کم ہم سب کا دعویٰ یہی ہے اور بعض معاملات میں اس کی یہ حیثیت عملی طور پر بھی سامنے آتی ہے۔ مثلاً پاکستان کے آئین کی رو سے (خواہ وہ ۱۹۵۶ء کا تھا یا ۱۹۶۲ء کا) صدر مملکت کا "مسلمان" ہونا لازمی تھا اور مملکت کے قوانین کا اسلام کے مطابق ہونا بھی بنیادی تقاضا تھا۔ اب محترم صدر مملکت نے یہ بھی فرما دیا ہے کہ اسلام کے بنیادی اصولوں کے منافی کسی بات کا پھیلانا مسلح افواج کے غیظ و غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔ آپ سوچئے کہ اسلام کی ہمارے ہاں پوزیشن تو یہ ہے (اور اس کی ایسی پوزیشن ہونی ہی چاہیئے) لیکن اس کا کوئی متفق علیہ مفہوم ہمارے ہاں متعین نہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہم بائیس برس سے پریشانیٔ فکر و نظر کی وادیوں میں بدحواس پھر رہے ہیں اور ہمارا کوئی قدم منزل کی طرف نہیں اٹھتا۔ اس لئے کہ جب منزل ہی متعین نہ ہو تو اس کی طرف قدم کیسے اٹھے؟ جو قوم بھی اپنے نظریات حیات کا مفہوم متعین نہیں کرتی، اس کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ یاد رکھئے۔ جب تک اسلام کا مفہوم متعین نہیں کیا جاتا، نہ ہمارے آئین و قوانین اسلام کے مطابق مرتب ہو سکتے ہیں، نہ ہم اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہمارا کون سا نظریہ اور عقیدہ اسلام کے خلاف ہے اور نہ ہی ہم میں ملی وحدت پیدا ہو سکتی ہے

اسے اچھی طرح سمجھ رکھنا چاہیئے کہ تعینِ منزل کا نام ایمان ہے اور اس کی طرف عملاً قدم اٹھانے کا نام اسلام اور یہی نظریۂ پاکستان ہے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد ہمارا سب سے پہلا فریضہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ ہم ان اصطلاحات کا صحیح مفہوم متعین کرتے۔ ہم نے آج تک یہ نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام اور نظریۂ پاکستان کے الفاظ دن رات دہرائے جاتے ہیں لیکن ہماری عملی زندگی میں ان کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ یہی بائیس برس پہلے کرنے کا کام تھا۔ اور یہی آج کرنے کا کام ہے۔ لیکن ——

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر!

(ﷺ)

طلوعِ اسلام کنونشن سنہ ۱۹۶۹ء

سال گذشتہ طلوعِ اسلام کنونشن اکتوبر میں منعقد ہوئی تھی اور احباب کی متفقہ رائے یہی تھی کہ کنونشن کے انعقاد کے لئے یہی موسم زیادہ موزوں رہتا ہے۔ لاہور کی بزمِ طلوعِ اسلام نے، جو کنونشن کی میزبانی کا حسین و شاداب فریضہ ادا کیا کرتی ہے، آئندہ کنونشن کے مسئلہ کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا ہے۔ امید ہے کہ اس سلسلہ میں عنقریب بزموں سے رابطہ قائم کیا جائے گا۔ یہ امور بعد میں طے ہوتے رہیں گے لیکن امسال کنونشن میں جو مسئلہ سب سے مقدم طور پر مرکوزِ توجہ رہیگا، یہ اعلان اسی کو سامنے لانے کے لئے ضروری سمجھا گیا ہے۔ بزموں کو معلوم ہے کہ طلوعِ اسلام کی قرآنی تحریک کے سلسلہ میں 'قرآنی کالج' کو منتہائی مقام حاصل ہے۔ اور للہ الحمد کہ اس تجویز کو عملاً متشکل کرنے کے لئے 'قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی' نے ضروری اقدامات شروع کر دیئے ہیں۔ لہٰذا اس دفعہ کنونشن میں نمائندگان کے سامنے سب سے اہم یہی سوال ہوگا کہ ان کی بزمیں اس باب میں کیا کچھ کر چکی ہیں اور آئندہ کے لئے کیا کچھ کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ نمائندگان اس سوال پر اپنی اپنی بزموں سے ضروری مشورہ کرنے کے بعد بہمہ وجوہ تیار ہو کر شریکِ کنونشن ہوں گے۔ میں اس ضمن میں اس سے زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ بزمیں اس حقیقت کو اچھی طرح پیشِ نظر رکھیں کہ

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

(میرزا) محمد خلیل، ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

قرآنی دعوت فکر کے عہد آفرین شاہکار

۱. لغات القرآن: یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے، اسکی تعلیم کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے؟ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے، چوتھی جلد ۱۲ روپے۔ مکمل سیٹ پچاس روپے

۲. اسلام کیا ہے؟: یہ مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتائیگی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی، معاشی، سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور غرض و غایت کیا اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے؟ (قیمت لٹ ائی۔ آٹھ روپے۔ جیب ایڈیشن۔ چار روپے)

۳. سلیم کے نام: سلیم ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے جسے ملا کے پیش کردہ مذہب نے دین سے متنفر کر دیا ہے۔ اسکے دماغ میں سینکڑوں اعتراضات پیدا ہوتے ہیں اور جناب پرویز ایک شفیق استاد کی طرح ان اعتراضات کے جواب خطوں کی شکل میں دیتے ہیں۔ اس کتاب نے ہمارے نوجوان طبقہ کے دل و دماغ میں نہایت خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ قیمت حصہ اول۔ آٹھ روپے۔ حصہ دوم۔ سوم۔ چھ چھ روپے

۴. نظام ربوبیت: نظام سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا دیا۔ کمیونزم نے اس جہنم کو ٹھنڈا کرنا چاہا لیکن اس کے شعلے اور تیز ہو گئے۔ کیا ان حالات میں نجات کی کوئی صورت ہے؟ ضرور ہے اور وہ قرآن کے معاشی نظام میں ہے جس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ یہ ہمارے دور کی ایک انقلاب آفرین کتاب ہے۔ قیمت چار روپے

۵. خدا اور سرمایہ دار: موضوع کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے۔ ہمارا دور عصر معاشیات کہلاتا ہے۔ ضرورت تھی کہ دنیا کے مروجہ معاشی نظاموں کا تجزیہ کر کے انکا مقابلہ قرآن کے معاشی نظام سے کیا جائے۔ اس کتاب میں یہ تمام گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ قیمت قسم اعلیٰ مجلد نو روپے۔ قسم دوم۔ پانچ روپے۔

۶. اسباب زوال امت: ملا کہتا ہے کہ ہم نے مذہب چھوڑ دیا ہے اس لئے ہم ذلیل ہیں۔ مسٹر کہتا ہے کہ ہماری ذلت کی وجہ ہی ہمارا مذہب ہے۔ یہ دونوں غلط کہتے ہیں۔ صحیح بات کیا ہے اسے معلوم کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ قیمت۔ دو روپے

یہ کتابیں اور پرویز صاحب کی تمام تصانیف کے ملنے کا پتہ

ادارہ طلوع اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ ۲ لاہور

از "شاہد عادل"

مجموعۂ قوانینِ اسلام جلد دوم
پر
ایک اجمالی نظر

آج سے کوئی ایک صدی قبل امتِ مسلمہ کے بعض روشن دماغ علماء نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ نئے زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق اسلامی قانون کی تدوینِ جدید ایک ناگزیر حقیقت بنتی جا رہی ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب اکثر اسلامی ممالک یا تو عثمانی خلافت کے زیرِ نگیں تھے یا ان کے زیرِ اثر۔ اور عثمانی حکومت کا سرکاری مذہب حنفی تھا۔ حنفی مذہب کی حمایت میں یہ لوگ کس حد تک پہنچ چکے تھے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مصر جہاں روایتی طور پر چاروں فقہی مذاہب پر عمل ہوتا رہا تھا، جب ان کے زیرِ اثر آیا تو وہاں حنفی فقہ کے مقابلے میں دوسرے فقہی مذاہب کو سرکاری طور پر ختم کرنے کا منصوبہ اپنایا گیا۔ (تاریخ القضاۃ فی الاسلام - از ابن طرطوس، صفحہ ۱۰۸)

اسلامی قانون کی تدوینِ جدید کی ابتداء

لیکن مقامِ مسرت ہے کہ ایک خاص فقہ کی تقلید کے باوجود ان لوگوں نے زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو کسی حد تک محسوس کیا، اور اسلامی قانون کی تدوین کی پہلی کوشش "مجلۃ الاحکام العدلیہ" کی صورت میں عمل میں آئی۔ اس پہلی کوشش میں جب حنفی فقہ کے بعض مسائل کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق نہ پایا گیا تو انہیں ترک کر کے دوسرے فقہی مذاہب کے فیصلوں کو اختیار کر لیا گیا۔ اور یہ آزادی اس حد تک برتی گئی کہ مسلمانوں کے جو فقہی مذاہب مٹ چکے تھے، ان کے مسائل اختیار کر لینے میں تامل نہ برتا گیا۔ مثلاً اسی مجلہ میں بیع کے سلسلے میں امام ابن شبرمہ کے فقہی مذہب سے خوشہ چینی کی گئی۔

جن اصولوں پر یہ کام سرانجام دیا گیا اس نے دوسرے اسلامی ممالک کے لئے عمدہ مثال کا کام دیا۔

اگرچہ یہ تمام ممالک اکثر و بیشتر حنفی فقہ کے زیر اثر تھے لیکن تدوین جدید میں انہوں نے اپنے آپ کو کسی خاص فقہی مذہب کا پابند نہ بنایا۔ مختلف ائمہ کے جس فیصلے کو زمانے کے تقاضے کے مطابق سمجھا گیا، اسے اختیار کر لیا گیا۔ مثلاً مصر میں جب عائلی قوانین کی تدوین ہوئی تو صغر سنی کی شادیوں کو روکنے کے لئے نکاح کی عمر کا تعین امام ابن شبرمہ کے فقہی مذہب کے مطابق کیا گیا۔ جو لڑکی کے لئے سولہ سال اور لڑکے کے لئے اٹھارہ سال تھی۔ (ایضاً صفحہ ۶۷)

پاکستان میں اسلامی قانون کی تدوین جدید

اس بارے میں ہمارے ملک میں علماء کے دو گروہ ہیں۔ ایک جدت پسند علماء کا اور دوسرے قدامت پسند کا۔ قبل الذکر گروہ کے نزدیک "موجودہ دور میں اسلامی ریاست کے تخیل کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سب سے بڑی ضرورت اسلامی قانون کی تدوین جدید کی ہے جس کے بغیر، اول تو یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا اور ہو بھی جائے تو وقت کے اہم مسائل سے ٹکرا کر خواب پریشاں ہو جائے۔"

(چراغ راہ "اسلامی قانون نمبر" جلد دوم۔ صفحہ اول پر امیر جماعت اسلامی کا پیغام)

یہ گروہ اسلامی قانون کی تدوین جدید اس لئے ضروری سمجھتا ہے کہ مسلمانوں میں مختلف رواجوں کی وجہ سے "اسلامی قانون اب عملاً منسوخ ہو چکا ہے اور اس کی جگہ ایک ایسا قانون ان کے تمدنی معاملات پر فرمانروائی کر رہا ہے جو تمدن و معاشرت کے اکثر و بیشتر معاملات میں کلیتہً غیر اسلامی ہے۔ اور اگر کسی حد تک اسلامی ہے بھی تو ادھورا۔" (حقوق الزوجین۔ از مولانا مودودی صاحب۔ ص۳)

قدامت پسند علماء کا فتویٰ

دوسری طرف قدامت پسند علماء کا طبقہ ہے۔ ان کے نزدیک اس قسم کی کسی تدوین جدید کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ جامعہ اشرفیہ لاہور کے مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی اپنے فتوے میں جس پر دوسرے مفتیوں کی بھی مہریں ثبت ہیں، فرماتے ہیں:-

"لہٰذا یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق و تفتیش کا کام پہلی صدی، دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اسی کا نام "فقہ اسلامی" ہے جو ائمہ ہدیٰ کی تحقیقات کا مجموعہ ہے۔"

(ہفت روزہ ایشیا۔ لاہور۔ بابت ۴ر اگست ۱۹۶۸ء۔ صفحہ ۱۳)

تدوین جدید کے اصول

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ تدوین جدید ہو تو کن اصولوں پر۔ اور ان اصولوں کو (DEFINE) کون کرے گا۔ جدت پسند علماء نے تو وہی طریقہ پسند کیا جو مصر میں اختیار کیا گیا، جو ایک سابق امیر جماعت (مولانا امین احسن اصلاحی) کے الفاظ میں

یوں ہے کہ کسی ایک متعین فقہ کی تقلید کی بجائے اسلام کے تمام فقہی مذاہب سے فائدہ اٹھایا جائے (چراغ راہ اسلامی قانون نمبر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۳۲/۹۹ء)۔ جماعت اسلامی بھی فقہی مسائل میں بالعموم اسی اصول کو اختیار کرتی ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں قرآن وسنت سے براہِ راست اجتہاد کا دعویٰ بھی موجود ہے۔

علماءِ کرام کا فرسودہ نظامِ تعلیم

جو علماءِ اسلامی قانون کی تدوین جدید چاہتے تھے، اُن کی کوششیں زیادہ تر اس مطالبہ پر صرف ہوتی رہیں کہ حکومت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے۔ حکومت نے اس مقصد کے لئے ایک ادارہ تحقیقات اسلامی قائم کر دیا جس کے مشیرِ قانون جناب تنزیل الرحمٰن صاحب نے پچھلے چھ سال کے عرصے میں اسلامی قانون کی جو تدوین کی ہے، اس وقت تک اس کی دو جلدیں ہمارے سامنے آچکی ہیں[1]۔ جو شخصی معاملات کے شرعی احکام پر مشتمل ہیں۔ مشیرِ قانون صاحب اس عظیم کام کو سرانجام دینے کی مشکلات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ کام علماء کے بس کا روگ نہیں کیونکہ "علمائے کرام اپنے فرسودہ نظامِ تعلیم اور مخصوص ذہنی تربیت کے سبب اس عظیم کام سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ صرف حکومت پر اسلامی قانون بنانے کی ذمہ داری ڈال کر علمی سطح پر خود کوئی عملی اقدام نہ کیا جائے۔ (صفحہ ۱۴۱-۴۳۔ اس مجموعہ کی دونوں جلدوں کے صفحات کے نمبر شمار مسلسل ہیں)۔ آئندہ سطور میں ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ وہ کام جس سے علماء عہدہ برآ نہیں ہوسکتے تھے، کن اصولوں پر کیا گیا ہے اور یہ کہ وہ مجموعی لحاظ سے ملک وملت کے لئے کس قدر مفید ہے[2]۔

مباحثِ کتاب

مجموعہ قوانینِ اسلام کی اس دوسری جلد میں زوجین کے درمیان تفریق کے شرعی احکام کو مدون کیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں فاضل مصنف نے اسلامی قانون کی برتری ثابت کرنے کے لئے، ترقی یافتہ ممالک کے تفریق زوجین کے قانون پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد لکھا ہے۔

> "حقیقت یہ ہے کہ ان نام نہاد ترقی یافتہ قوانین کے مقابلے میں اسلامی قانونِ طلاق، توازنِ عدل، انصاف، رواداری، اخلاق وعصمت کی محافظت، محبت ومودت، مقاصد نکاح کے حصول، نجاتِ اخروی، مصلحتِ عامہ اور انسانی فطرت کے اصولوں پر قائم ہے اور ہم فخر کیساتھ دنیا کے سامنے یہ دعوے کر سکتے ہیں کہ چودہ سو سال پہلے جو قانون اللہ اور اس کے رسول نے عطا کیا ہے وہ مغربی دنیا کے موجودہ قوانینِ طلاق سے افضل اور بدرجہا بہتر ہے۔ اس دعویٰ کے

---

[1] حال ہی میں اس کی تیسری جلد بھی شائع ہوئی ہے۔ (طلوعِ اسلام)

[2] اس مجموعہ کی پہلی جلد پر طلوعِ اسلام میں پہلے تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

ثبوت میں انتہائی انکسار اور عاجزی کے ساتھ یہ کتاب حاضر ہے) (صفحہ ۴ ۳۵)

کتاب کے مباحث میں سے دو مباحث بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ ہیں طلاق اور خلع۔ طلاق کے بارے میں تو کچھ تفصیلات پہلی جلد میں بھی آگئی تھیں البتہ خلع کے بارے میں تمام تفصیلات اسی جلد میں دی گئی ہیں[1] اسلئے یہ مسئلہ اس جلد کا اہم ترین مسئلہ ہے اور اس کی اہمیت کے لحاظ سے ہم اپنے تبصرے کا آغاز اسی سے کرتے ہیں۔

خلع کیلئے عدالت کی شرط

فاضل مؤلف نے اس بارے میں جو قانون مدون کیا ہے اسے نقل کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مختصر شرعی تعریف سامنے لائی جائے۔ فقہ کی کتابوں میں اس اصطلاح کی لمبی چوڑی تفصیلات ہیں لیکن ہم اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے علامہ ابن رشدؒ کی تعریف نقل کرتے ہیں جو نہ صرف مختصر ہے بلکہ جامع بھی ہے۔ فرماتے ہیں۔

جعل الطلاق بید الرجل اذا فرك المرأة۔ جعل الخلع بید المرأة اذا فرکت الرجل۔ (بدایۃ المجتہد۔ جلد ۲۔ صفحہ ۶۸)

مرد جب بیوی کو ناپسند کرے تو اس سے علیحدگی کے لئے اس کے ہاتھ میں طلاق ہے اور عورت جب مرد کو ناپسند کرے تو مرد سے علیحدگی کے لئے اس کے ہاتھ میں خُلع ہے۔

فاضل مؤلف نے دفعہ ۱۱۶ کے تحت خلع کے جواز کے لئے عدالت کی شرط لگاتے ہوئے یہ اسلامی قانون مدوّن کیا ہے۔

"اگر عدالت کو اس امر کا اطمینان ہو گیا ہو کہ زوجین شدید ناچاقی کے سبب باہمی مباشرت میں احکام خداوندی کی پابندی نہ کر سکیں گے تو شوہر کو خلع کا حکم دے گی۔ مگر شرط یہ ہے کہ اگر قصور مرد کا پایا جائے گا تو عدالت بلا معاوضہ تفریق کرا دے گی۔ مزید شرط یہ ہے کہ اگر قصور عورت کا ہو یا دونوں میں سے کسی کا نہ ہو مگر حالات خلع کے متقاضی ہوں تو شوہر کو عورت سے مناسب معاوضہ دلوایا جائے۔" (صفحہ ۵۸۰)

خلع کا مروجہ طریقہ اور فاضل مؤلف

عورت، ہمارے معاشرہ میں ایک مظلوم فریق کی حیثیت رکھتی ہے اور اس مظلومیت کی ایک بڑی وجہ یہ

---

[1] مرد اور عورت میں یہ تفریق قرآنی نہیں۔ قرآن میں خلع کا لفظ تک نہیں آیا۔ طلاق، فسخ معاہدۂ نکاح کا نام ہے خواہ اس کا تقاضا مرد کی طرف سے ہو خواہ عورت کی طرف سے۔ (طلوع اسلام)

ہے کہ اس پر معاش کے اکثر دروازے بند ہیں لہٰذا وہ مرد کی دست نگر رہتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ وہ اپنے "ان داتا" خاوند سے علیحدہ ہونے سے پہلے ہزار مرتبہ سوچے گی، بالخصوص اس لئے کہ ہمارے معاشرہ میں مطلقہ عورت کے لئے عقدِ ثانی کے مواقع بہت کم ہوتے ہیں۔ بنابریں وہ ساری عمر خاوند کے ظلم سہتی رہتی ہے لیکن علیحدگی کا نام نہیں لیتی۔ وہ طلاق کا ارادہ اس وقت کرے گی جب پانی سر سے گذر جائے اور اس کے سوا اسے کوئی چارۂ کار نظر نہ آئے۔ لیکن ہمارے ہاں شریعت کے نام پر عجیب قانون رائج ہو چکا ہے کہ مرد تو جب چاہے اپنی بیوی کو تین طلاق کہہ کر علیحدہ کر دے اور پھر ایک نئی بیوی لے آئے لیکن اگر عورت خاوند کے مظالم سے تنگ آکر اپنے علیحدگی کے شرعی حق کو استعمال کرنا چاہے تو اسے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے، قطع نظر اس کے کہ عدالت شرعی ہو یا غیر شرعی۔ لیکن فاضل مؤلف اسی رواج کو دفعہ ۱۱۷ کے تحت اسلامی قانون کے نام سے مدون کرتے ہیں حالانکہ اس معاملہ میں مرد کے لئے الگ قانون اور عورت کے لئے الگ، قرآن مجید کے یکسر خلاف ہے۔ پھر مروجہ قانون کی رُو سے عورت کے لئے خلع حاصل کرنے کے لئے جو شرائط ہیں وہ قرآن اور حدیث دونوں کے خلاف جاتی ہیں۔ قرآن مجید نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ تمہارے لئے یہ حلال ہی نہیں کہ تم عورت کی مرضی کے خلاف اس کے مالک بنے رہو۔ لہٰذا عورت کو فسخ نکاح کے لئے کراہت کی شرط کافی ہے۔ جہاں تک احادیث کا تعلق ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

خلع کے شرعی احکام

کے سامنے خلع کے جو معاملات آئے ان میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کی شکایت اور فیصلہ کو کافی سمجھا اور ان سے علیحدگی کے فیصلہ کی وجہ تک نہیں پوچھی اور خاوند کی رضامندی دریافت کئے بغیر زوجین میں تفریق کرا دی۔ مفسرین نے یہاں تک لکھا ہے کہ آپ نے مردوں سے یہ تک بھی دریافت نہ کیا کہ

هل انت كارهها كما كرهتك ام لا۔ (فتح الباری شرح بخاری جلد ۱۱ صفحہ ۳۲)

کہ کیا تم بھی اپنی بیوی کو ناپسند کرتے ہو جس طرح وہ تمہیں ناپسند کرتی ہے۔

یعنی حضور صلعم نے علیحدگی کی وجوہات پر کوئی عدالتی بحث نہ فرمائی بس عورت کے فیصلے کو چاہے وہ غلط تھا یا صحیح نافذ فرما دیا۔

اور یہی فقہائے امت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ خلع کے لئے عدالت کے فیصلہ کی کوئی شرط نہیں۔ ملاحظہ ہو بدایۃ المجتہد جلد ۲ صفحہ ۶۹)۔ نیز قاضی ابوبکر جصاص "کی یہ عبارت ملاحظہ ہو۔

قال ابوحنيفة و ابو يوسف و محمد و زفر و مالك و حسن بن صالح و الشافعی یجوزنا الخلع بغير سلطان و ساوی مثله عن عمر و عثمان و

ابن عمر رضی اللہ عنہم (احکام القرآن - جلد ۲ - صفحہ ۲۳۵)

امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ، امام محمدؒ، امام زفرؒ، امام مالکؒ، امام حسن بن صالحؒ، امام شافعیؒ کے نزدیک خلع عدالت کے بغیر جائز ہے۔ اور یہی مسلک حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت کیا گیا ہے۔

مروجہ طریقہ کیخلاف احتجاج

ہمیں ان اسباب کا تو علم نہیں جن کی بنا پر ہمارے ہاں خلع کا یہ طریقہ رواج پذیر ہوا۔ لیکن اس غیر قرآنی شرط کے خلاف آوازیں ضرور بلند ہوتی رہیں۔ مثلاً مودودی صاحب اپنی کتاب حقوق الزوجین میں فرماتے ہیں۔

"خلع کے مسئلہ میں دراصل یہ سوال قاضی کے لئے تنقیح طلب ہے ہی نہیں کہ عورت آیا جائز ضروریات کی بنا پر طالب خلع ہے یا محض نفسانی خواہشات کے لئے علیحدگی چاہتی ہے۔ اس لئے نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین نے قاضی ہونے کی حیثیت سے جب مقدمات خلع کی سماعت کی تو اس سوال کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ اول تو اس سوال کا لحاظ، تحقیق کرنا کسی قاضی کے بس کا کام نہیں۔ دوسرے خلع کا حق عورت کے لئے اس حق کے مقابلہ میں ہے جو مرد کو طلاق کی صورت میں دیا گیا ہے۔ ذواقیت کا احتمال دونوں صورتوں میں یکساں ہے۔ مگر مرد کے حق طلاق کو قانون میں اس قید کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا ہے کہ وہ ذواقیت کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔ بس جہاں تک قانونی حق کا تعلق ہے عورت کے حق خلع کو بھی کسی اخلاقی قید سے مقید نہ ہونا چاہیئے۔"

(حقوق الزوجین طبع ششم صفحہ ۷۰، ۷۱)

شرعی دلیل کی خطرناک تاویل

لیکن "مجموعہ قوانین اسلام" کے مؤلف چونکہ اس رواجی طریقہ کو اسلامی قانون بنانے پر تلے ہوئے ہیں اسلئے وہ قرآن وسنت کے حکم یا ائمہ و فقہاء کے فیصلے کو کس طرح تسلیم کر لیتے۔ چنانچہ وہ بڑی چابکدستی اور ہنرکاری سے پہلے تو یہ تاثر دیتے ہیں کہ یہ قرآن و حدیث کا نہیں بلکہ اہل فقہ کا اجتہادی مسئلہ ہے اور پھر اس کی یوں تاویل کرتے ہیں۔

"لیکن فقہاء کے نزدیک خلع کے لئے حاکم وقت کی موجودگی ضروری نہ ہونے کا صرف یہ مطلب لیا جائے گا کہ فریقین باہمی خلع کرانا چاہیں تو اس کے جواز کے لئے حکم حاکم یا قاضی کی شرط نہیں چنانچہ اگر فریقین باہمی رضامندی سے علیحدگی اختیار کرنا چاہیں تو اس کو فقہی اصطلاح میں مبارأت کہا گیا ہے جو خلع کے حکم میں ہے۔ لیکن اگر فریقین میں ناچاقی ہو تو اس کا فیصلہ کہ وہ حدود اللہ کو

> قائم نہ رکھ سکیں گے اور خلع کرنا چاہیں، کوئی تیسرا شخص ہی کر سکتا ہے۔ اور ایسی صورت میں خلع عدالت کے ذریعے کرایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اگر عورت رشتۂ زوجیت کو منقطع کرنا چاہے اور مرد کو اس کا بدل دینے کے لئے آمادہ ہو تو اسلام مذکورہ شرائط کے ساتھ عورت کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ حاکمِ وقت یا اس کی قائم کردہ عدالت میں حاضر ہو کر استغاثہ پیش کرے اور بذریعہ عدالت شوہر سے خلع حاصل کرے[1]۔" (صفحہ ۵۹۳)

دیکھئے کس طرح فاضل مؤلف نے ایک خلافِ قرآن، خلافِ سنت اور خلافِ جمہور فقہا رواج کو اسلامی قانون بنا کر دکھا دیا ہے۔

دوسرا اہم مسئلہ طلاق

تفریقِ زوجین کے سلسلے کا دوسرا اہم مسئلہ طلاق کا ہے۔ ہم یہ دعویٰ تو کرتے نہیں تھکتے کہ اسلام نے اس مسئلہ کا حل بڑا ہی سادہ اور عین انسانی فطرت کے مطابق کیا ہے لیکن حرام ہے جو عامۃ الناس کو کبھی اس فطرتی حل کی طرف لانے کی کوشش کی گئی ہو۔ یہاں تک کہ بقول مفتی محمد شفیع صاحب 'ہمارے ہاں صورتِ حال یہ ہو چکی ہے کہ کوئی طلاق کے اسلامی طریقہ کو جانتا تک نہیں اور معاملہ اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ

> "آج کل عام جہالت کی وجہ سے ہر طلاق دینے والا تین ہی طلاق دیتا ہے اور عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ تین سے کم میں طلاق مکمل ہی نہیں ہوتی۔ عدالتوں کے عرائض نویس بھی جب ان کو طلاق نامہ لکھنے کو کہا جاوے تو تین ہی طلاق لکھتے ہیں۔"
>
> (عائلی قوانین پر مختصر تبصرہ۔ از مفتی محمد شفیع صاحب صفحہ ۶۳)

طلاق کے اس غیر اسلامی رواج کے جو قبیح نتائج سامنے آتے رہتے ہیں، ان کو ختم کرنے کے لئے اگر طلاق کے غیر اسلامی رواج (یعنی طلاق بدعت) کو ختم کر کے عامۃ الناس کو اصلی اسلامی طریقہ کی ...... طرف لایا جاتا ہے تو مجموعہ قوانین کے فاضل مؤلف جیسے اہلِ قلم، طلاقِ بدعت کی حمایت میں دلائل کے انبار لگا دیتے ہیں۔ مجموعہ زیرِ نظر میں انہوں نے سب سے زیادہ دلائل طلاقِ بدعت کی حمایت میں دیئے ہیں جو پورے

---

[1] قرآن کی رُو سے عدالت یا تو مصالحت کرانے کے لئے بطورِ ثالث درمیان میں آئے گی یا یہ متعین کرنے کے لئے آیا عورت کے لئے مرد کو کچھ معاوضہ دینا ضروری ہے یا نہیں۔ عدالت کا منصب اس امر کا فیصلہ کرنا نہیں کہ عورت کی درخواست پر فسخ نکاح کیا جائے یا نہیں۔ عورت جس طرح 'مرد کی طرح' معاہدۂ نکاح اپنی مرضی سے (بلا مداخلتِ عدالت) استوار کر سکتی ہے، اسی طرح وہ اس معاہدہ کو اپنی مرضی سے بغیر کسی اور کی مداخلت کے فسخ بھی کر سکتی ہے۔ اس باب میں مرد اور عورت میں کسی قسم کی تفریق کرنا خلافِ قرآن ہے۔ (طلوعِ اسلام)

تہتر صفحات پر (صفحہ ۴۹۶ سے لے کر ۵۶۸ تک) پھیلے ہوتے ہیں۔ ان میں سے دس صفحات میں تو علامہ ابن قیم کے دلائل کا رد کیا گیا ہے۔ یعنی طلاق بدعت کی حرمت کے بارے میں امام ابن قیم کے وہ مشہور دلائل، جن کی مخالف و موافق، سب اہل علم نے تعریف کی ہے۔

عُسَیْلَة کا نادر ترجمہ

طلاق بدعت کی حمایت میں فاضل مؤلف جس نتیجہ پر پہنچے ہیں اس کو نقل کرنے سے پہلے ایک علمی لطیفہ ملاحظہ ہو جس سے ان کی حدیث و فقہ پر دسترس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں ایک لفظ عُسَیْلَة سینکڑوں کیا بلکہ ہزاروں مرتبہ آیا ہے۔ طلاق مغلظہ کے بعد عورت کے اپنے پہلے خاوند کے ساتھ نکاح کے سلسلے میں کئی احادیث آئی ہیں جن میں ایسی عورت کو کچھ اس قسم کے الفاظ میں حکم دیا گیا ہے۔

"حتّٰی تذوقی عُسَیْلَتَهٗ و یذوق عُسَیْلَتَكِ۔" (یعنی یہاں تک کہ تم عورت دوسرے مرد کا عسیلہ چکھ لو اور وہ مرد تمہارا عسیلہ چکھ لے۔)

مستند کتب لغت میں عسیلہ کے معنی یوں دیئے گئے ہیں۔

النطفة او ماءُ الرّجل او حلاوة الجماع۔ (القاموس المحیط)۔ یعنی نطفہ، یا مرد کی منی، یا جماع (ہم بستری) کی لذت۔

فاضل مؤلف نے اس لفظ کا بالکل انوکھا اور نادر ترجمہ کیا ہے۔ یعنی

"جب تک تم اس (شوہر ثانی) کا شہد نہ چکھ لو اور وہ تمہارا شہد نہ چکھ لے۔" (صفحہ ۴۱۳)

ایسے کثیرالاستعمال لفظ کا اس قدر طفلانہ اور مضحکہ انگیز ترجمہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ فاضل مؤلف کی علمی سطح کیا ہے اور انہیں کتب حدیث و فقہ پر کس قدر عبور حاصل ہے!

طلاق بدعت کے بارے میں نتیجہ فکر

اس جملہ معترضہ کے بعد ہم اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں۔ طلاق بدعت[1] کے جواز کے بارے میں مؤلف جس نتیجہ فکر تک پہنچے ہیں، وہ ان کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ ہو:۔

"ہمارے نزدیک تین طلاق کے وقوع کے اثبات کے لئے صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت ہی کافی ہوتی کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کون مسلمان یہ توقع کر سکتا ہے کہ رسول اللہ صلعم

---

[1] یعنی لفظ طلاق تین بار (طلاق، طلاق، طلاق یا تین طلاق) کہہ کر اس سے ایسی طلاق مراد لینا جس کے بعد میاں بیوی میں نکاح کی گنجائش نہ رہے۔ (طلوع اسلام)

سے مجموعی تین طلاق کا ایک ہی طلاق ہونا ثابت ہوا اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو طلاق مغلظ قرار دیں۔" (صفحہ ۵۵۰) ..... یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو شریعتِ محمدی کی پیروی میں سب سے زیادہ سخت گیر تھے، حضورؐ کی شریعت کے خلاف اپنی رائے سے فیصلہ کریں اور حضرت ابن عباسؓ جو عالمِ امت کہلائے، حضورؐ سے روایت کے خلاف فتویٰ دیں؟

"مندرجہ بالا بحث و نظائر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دفعتہً تین طلاقیں دیئے جانے کی صورت میں ان کے وقوع کے متعلق اختلاف تابعین کے دور میں شروع ہوا۔ لیکن چونکہ وہ دور روایت کا تھا اس لئے یہ اختلاف کسی فقہی مذہب کی حیثیت اختیار نہ کر سکا۔ بالخصوص ائمہ اربعہ کے اجماع کے بعد امت مسلمہ کے نزدیک راجح اور مفتیٰ بہ یہی مذہب قرار پایا کہ دفعتہً تین طلاق دیئے جانے کی صورت میں تین طلاقیں ہی واقع ہوں گی۔" (صفحہ ۵۵۱)

اس نتیجہ فکر میں جو مغالطہ آفرینیاں ہیں اگر ان کے رد میں دلائل دیئے جائیں تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔ اور اسی طوالت کے خوف سے ہم ان اسباب کو بھی سامنے نہیں لانا چاہتے جن کی بنا پر ملوکیت نے اس قسم کی طلاق کو رائج کرنے میں دلچسپی لی۔ اس وقت ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں طلاق بدعت کی حمایت میں یہ سارا زور صرف اس لئے صرف کیا جا رہا ہے کہ حکومت نے عائلی قوانین میں اس کو ختم کر دیا ہے اور بعض علماء مفلوم وجوہات کی بنا پر حکومت کے اس فیصلہ کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم اپنی طرف سے کچھ کہے بغیر عائلی قوانین کے ایک مخالف ہی کی زبانی اس مسئلہ کی شرعی تحقیق قارئین کے سامنے لاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"بیک وقت تین طلاق دے کر عورت کو جدا کر دینا نصوص صریحہ کی بنا پر معصیت ہے۔ علمائے امت کے درمیان اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اس امر میں ہے کہ ایسی تین طلاقیں ایک طلاق رجعی کے حکم میں ہیں یا تین طلاق مغلظ کے حکم میں۔ لیکن اس کے بدعت اور معصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ سب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فعل اس طریقے کے خلاف ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے طلاق کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ اور اس سے شریعت کی اہم مصلحتیں فوت ہو جاتی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دے دیں تو حضورؐ غصہ میں آکر کھڑے ہو گئے۔ اور فرمایا۔ ایلعب بکتاب اللہ عزوجل و انا بین اظہرکم۔ کیا اللہ عزوجل کی کتاب سے کھیل کھیلا جاتا ہے۔ حالانکہ ابھی میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ بعض دوسری احادیث میں تصریح ہے کہ حضورؐ نے اس فعل کو معصیت فرمایا۔ حضرت عمرؓ کے متعلق تو روایات میں یہاں تک آیا ہے کہ جو شخص ان کے پاس مجلس واحد میں تین طلاقیں دینے والا

آتا تو وہ اس کو درے لگاتے تھے ۔"

(حقوق الزوجین ۔ از سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب ۔ صفحہ ۱۵۰ ۔ ۱۵۵)

اب اگر فاضل مؤلف کے نتیجہ فکر کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ طلاق بدعت، معصیت تو کجا، بدعت بھی نہیں رہتی۔ بلکہ اس سے بدعت کا داغ دھونے کے لئے مؤلف نے ایک درجن سے زیادہ احادیث پیش کی ہیں اور جب اتنی احادیث سے اس کا ثبوت حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جائے تو پھر کس کی جرأت ہے کہ اسے طلاق بدعت کا نام دے !

طلاق بدعت اور صحابہ کرامؓ

فاضل مؤلف نے اپنے نتیجہ فکر میں جن غلط بیانیوں سے کام لیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے (جو انہوں نے کہا ہے) کہ اس کے وقوع کے متعلق اختلاف تابعین کے دور میں شروع ہوا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ صحابہ کرام جن کے دور میں اس کے وقوع کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اس غلط بیانی کی تردید کے لئے بھی مودودی صاحب کی تحریر کافی تھی لیکن وہ چونکہ مختصر تھی اس لئے ہم اس کی تائید میں دو ایک دلائل اور پیش کئے دیتے ہیں پہلے آپ امام ابراہیم النخعی کی زبانی یہ سنئیے کہ کس قسم کے معدودے چند افراد نے اس کا ارتکاب کیا۔ امام فخرالدین رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں۔

عن ابراهيم النخعي ان اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم كانوا يستحبون ان لا يطلقوا ازواجهم للسنة الا واحدةً ثم لا يطلقوا غير ذالك حتى تنقضى العدة و ماكان اخسّ عندهم من ان يطلق الرجل ثلاث تطليقات۔ (تفسیر کبیر جلد ۲ ۔ صفحہ ۳۰)

امام ابراہیم نخعی سے روایت ہے کہ صحابہ کرام صرف سنت طریقہ پر ہی طلاق دینا پسند کرتے تھے اور وہ صرف ایک ہی طلاق دیا کرتے تھے (تاکہ رجوع کی گنجائش باقی رہے) یہاں تک کہ عدت گذر جائے۔ اور یہ بہت ہی گھٹیا پن تصور کیا جاتا تھا کہ کوئی شخص تین طلاق دے۔

خیال رہے کہ یہاں تین طلاق سے طلاق بدعت مراد نہیں بلکہ مناسب مناسب وقفے کے بعد دوسری اور تیسری طلاق دینا ہے۔ لیکن ملاحظہ فرمایئے کہ ایسا کرنے والے کو بھی صحابہ خسیس خیال کرتے تھے۔ کجا کہ طلاق بدعت کا ارتکاب کیا جائے۔ اسلئے اس بات کا تو سرے سے امکان ہی نہیں کہ کسی صحابیؓ رسول سے یہ معصیت سرزد ہوئی ہو۔ ہاں حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب دیہاتی بدوؤں نے اپنی جہالت کی وجہ سے اکا دکا واقعات میں اس کا ارتکاب کیا تو آپ نے اس قبیح عادت کو روکنے کے لئے یہ حکم دے دیا کہ جو شخص اس قسم کا کھیل کھیلے گا

لئے اس کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ یعنی حکومت اسے طلاق مغلظہ تسلیم کرلے گی جس سے اسے مراجعت کا حق باقی نہیں رہیگا۔[1] لیکن اس صورت حال کے باوجود بعض صحابہ کرام ؓ نے اس کے وقوع کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی تفصیلات علامہ ابن قیم کی زبانی سنیئے۔ فرماتے ہیں۔

"وافتی ابن عباس وعلی وابن مسعود بان الطلقات الثلث من فم واحد واحدۃ" وافتوا ایضا بانها مغلظة" وافتی الزبیر بن عوام وعبد الرحمٰن بن عوف وعکرمة وطاؤس ومحمد بن اسحاق وخلاص بن عمر والحارث العکلی وداؤد بن علی واکثر اصحابه وبعض اصحاب مالك وبعض اصحاب الحنیفة وبعض اصحاب احمد بانها واحدۃ۔"

(اعلام الموقعین جلد ۳ صفحہ ۴۶)

حضرت ابن عباس، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے دونوں طرح کی روایات ہیں۔ یعنی ایک دفعہ کی تین طلاقیں ایک طلاق کا حکم رکھتی ہیں اور یہ قول بھی کہ ایسی طلاق مغلظہ ہوگی۔ حضرت زبیرؓ بن عوام، حضرت عبدالرحمٰن ؓ بن عوف، عکرمہ، طاؤس، محمد بن اسحاق، خلاص بن عمر، حارث عکلی، داؤد بن علی اور ان کے اکثر تلامذہ، بعض مالکی، بعض حنفی اور بعض حنبلی فقہاء کے نزدیک ایسی طلاق ایک ہی یعنی طلاق رجعی کے حکم میں ہے۔

اہل تشیع کے تینوں فقہی مذاہب کے نزدیک ایسی طلاق سرے سے لغو ہے۔

قارئین نے طلاق بدعت کے بارے میں فاضل مؤلف کا نتیجہ فکر دیکھ لیا ہے۔ انہوں نے اس سے بدعت کا داغ دھونے کے لئے متعدد روایات اور آثار پیش کئے ہیں۔ اب ان کے منطقی دلائل کا اندازہ لگانے کے لئے

منطقی دلائل کی جھلک

ان کی ایک منطقی دلیل کی جھلک دیکھئے۔ فرماتے ہیں۔

"علاوہ ازیں ایک شے کا محض اقتضاء نص یا مفہوم مخالف کی دلیل کی بنا پر خلاف قرآن ہونا اس شے کے وجود کو عدم میں کیونکر تبدیل کرسکتا ہے۔ یا یہ کہ اگر ایک فعل کرنے سے قرآن منع کرتا ہے اور وہ فعل کر لیا جائے تو وہ باطل کیونکر قرار پا سکتا ہے اور اس کا وجود اور عدم کیونکر برابر ہو سکتا ہے؟ مثال کے طور پر قرآن، زنا اور چوری سے منع کرتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ان افعال کا ارتکاب کرے (جو صریحاً قرآن کیخلاف

[1] ہم تاریخ کے اس بیان کو صحیح نہیں سمجھتے۔ (طلوع اسلام)

ہوگا)، تو کیا یہ کہا جائے گا کہ اس کا یہ فعل باطل ہے[1]" (صفحہ ۵۱۹)

یہ دلیل کسی تبصرہ کی محتاج نہیں۔ قارئین خود ہی اندازہ لگائیں کہ فاضل مؤلف ایک خلافِ قرآن طریقۂ طلاق کی حمایت میں کس سطح پر جا پہنچے ہیں۔ حالانکہ ان کی یہ نادر دلیل خود ان کی لمبی چوڑی بحث کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ وہ یوں کہ اگر طلاقِ بدعت کا وجود "زنا" اور چوری کی طرح ثابت ہوتا ہے تو کیا کبھی کسی اہل علم نے "زنا اور چوری" کے حق میں ایک درجن سے زیادہ احادیث نقل کر کے اس کو رائج کرانے کی کوشش کی ہے؟

طلاقِ بدعت کی حمایت کیوجہ

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ طلاق، قرآن و سنت کے خلاف ہے تو فاضل مؤلف اس کی حمایت میں یہ دلائل کے انبار کیوں لگا رہے ہیں۔ جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں، معاملہ یوں نظر آتا ہے کہ حکومت نے عائلی قوانین نافذ کئے۔ ان میں کئی خامیاں ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان میں طلاقِ بدعت کا خاتمہ قرآن و سنت کے عین مطابق تھا۔ علماء کی طرف سے ان عائلی قوانین کی مخالفت ہوئی اور جوشِ مخالفت میں طلاقِ بدعت کے خاتمے جیسی اچھی باتیں بھی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ مجموعہ قوانین کے مؤلف بھی اسی رو میں بہے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن اس سارے معاملہ کا مضحکہ خیز پہلو یہ ہے کہ حکومت ایک قانون نافذ کرتی ہے جو بالاتفاق کتاب و سنت کے مطابق ہے۔ لیکن حکومت ہی کے قائم کردہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے مشیر قانون، اس قانون کے مخالفین کی تائید میں صفحے پر صفحے سیاہ کر رہے ہیں۔ کیا بات ہے حکومت کے اس ادارہ کی!

طلاقِ بدعت کے نتائج بد

کسی نے سچ کہا ہے کہ اگر ایک جھوٹ بولا جائے تو اس جھوٹ کو قائم رکھنے کے لئے سو جھوٹ اور بولنے پڑتے ہیں اور ایک برائی کے ارتکاب کے بعد لازماً بہت سی اور برائیوں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔ یہ صورت طلاقِ بدعت کے ساتھ ہے۔ اس کو غلط قرار دیا گیا تو ایک قبیح برائی نے سر اٹھایا۔ وہ برائی حلالہ کی تھی یعنی اگر طلاقِ بدعت کے بعد کوئی مرد اپنے کئے پر پشیمان ہوتا تو ایک حیلہ کے ذریعے اس کا تدارک کیا جاتا وہ اس طرح کہ اس مطلقہ عورت کا ایک دن کے لئے کسی اور مرد سے وقتی نکاح کر دیا جاتا جو ایک ہمبستری کے بعد طلاق دے دیتا اور اس طرح اس عورت کو پہلے خاوند کے لئے پھر سے جائز کر لیا جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ زمانہ جاہلیت کی رسم تھی اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے بڑی سختی سے روک دیا تھا اور آپ نے حلالہ کرنے اور کرانے والے پر اللہ کی لعنت بھیجی۔ (لعن اللہ المحلل والمحلل لہ)۔ حضرت عمرؓ نے جب اپنے دور کے

---

[1] باطل نہیں تو کیا یہ کہا جائے گا کہ اس کا یہ فعل مبنی برحق ہے؟ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (طلوع اسلام)

شاذ و نادر طلاق بدعت کے واقعات کو مغلظ قرار دے دیا تو اس برائی کے سر اٹھانے کا امکان تھا۔ اس کے لئے آپ نے ساتھ ہی یہ سخت اعلان بھی کر دیا کہ

لا اوتی بمحلل و المحلل لہ الا رجمتھما۔

میرے پاس جو بھی حلالہ کرنے یا کرانے والے لائے جائیں تو ان دونوں کو سنگساری کی سزا دوں گا۔

حلالہ کی گنجائش

اس سخت حکم نے طلاق بدعت کے وقوع ہی کو بڑی حد تک کم کر دیا ہوگا۔ لیکن بعد میں جب طلاق بدعت نے طلاق سنت کی جگہ لینی شروع کی تو لامحالہ "حلالہ" کے لئے بھی گنجائش نکالنی پڑی اور اس کو حرام قرار دیتے ہوئے بھی کسی حد تک جائز قرار دے دیا گیا۔ حنفی فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہمیں اس کے بارے میں یہ حکم ملتا ہے۔

و اذا تزوجھا بشرط التحلیل فالنکاح مکروہ لقولہ علیہ السلام لعن المحلل و المحلل لہ و ھذا ھو محملہ فان طلقھا بعد وطی حلت للاول لوجود الدخول فی نکاح صحیح"۔ (ہدایہ اولین مجیدی صفحہ ۳۷۶)

اگر حلالہ کی شرط سے کسی عورت سے نکاح کیا تو یہ مکروہ فعل ہے۔ کیونکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حلالہ کرنے والے اور کرانے والے دونوں پر اللہ کی لعنت بھیجی ہے اور اس سے مراد یہی حلالہ ہے تاہم اس (حلالہ کے نکاح اور ہم بستری کے بعد عورت کو طلاق دے دی جائے تو وہ پہلے خاوند کے لئے حلال ہو جائے گی کیونکہ دخول نکاح صحیح میں ہوا ہے۔ (چاہے حلالہ والی شرط باطل تھی)

اور فاضل مؤلف کو بھی اسی راہ چلنا پڑا۔ دفعہ نمبر ۱۱۱ میں فرماتے ہیں۔

"اور وہ عورت بدون "حلالہ" اس مرد سے دوبارہ نکاح نہ کر سکیگی"۔ (صفحہ ۵۶۸)

یہ تو تھے کتاب کے دو اہم بنیادی مباحث جن میں ہمیں ذرا تفصیل سے جانا پڑا۔ اب چند دیگر مسائل مختصراً ملاحظہ ہوں۔

لونڈی غلاموں کی طلاق کی تفصیلات

جس زمانے میں ہماری فقہ مرتب ہوئی ہے اس وقت عام معاشرہ میں غلاموں کی کثرت تھی۔ جس کی وجہ سے فقہ کی کتابیں ان کے خصوصی مسائل سے بھری پڑی ہیں۔ ان تفصیلات کا اندازہ علامہ محمد الخضری کے اس قول سے لگایئے کہ اگر ہماری کتب فقہ سے "قسم" "لونڈیوں" "غلاموں اور طلاق کے

زاید مسائل خارج کر دیئے جائیں تو ان کا حجم نصف سے بھی کم رہ جائے۔ (تاریخ التشریع الاسلامی) خیر اس زمانے میں چونکہ غلاموں اور لونڈیوں کا عملاً وجود تھا چاہے ان کی شرعی حیثیت کچھ بھی ہو، تو ان مسائل کی کسی حد تک ضرورت بھی تھی۔ لیکن آج صورت حالات بالکل بدل چکی ہے۔ تہذیب جدید کو جتنا چاہو برا کہو لیکن اس نے انسانیت کے دامن سے غلامی کا داغ دھو دیا ہے۔ اب اگر کسی ملک میں اس کا وجود تو کیا معمولی سی جھلک بھی نظر آجائے تو ساری دنیا کی نفرت بھری نگاہیں اس طرف اٹھنے لگتی ہیں۔

پاکستان میں اسلامی قانون کی تدوین جدید کو بڑی اہمیت دی جا رہی ہے اور اسلامی دنیا تو کیا غیر اسلامی مستشرقین کی نگاہیں بھی اسی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اب اگر ایک سرکاری ادارہ کی طرف سے اسلامی قانون کی تدوین جدید میں اس جدید زمانے میں لونڈیوں، غلاموں کے نکاح و طلاق کے مسائل مدون کئے جائیں جیسا کہ فاضل مؤلف نے صفحہ ۱۷۳ سے ۱۷۴ تک کیا ہے تو دنیا ہمارے متعلق کیا سوچے گی کہ کہیں اس ملک میں کسی سطح پر غلامی کا رواج تو نہیں؟

طلاق مکرہ

طلاق مکرہ سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص پر ناجائز دباؤ ڈال کر اس سے زبردستی طلاق دلوائی جائے۔ یہ فعل چونکہ قرآن و سنت کے خلاف تھا اس لئے امت مسلمہ کے جمہور ائمہ نے اس کا جواز تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن چونکہ اس مسئلہ سے ملوکیت کے مفاد وابستہ تھے اسلئے ائمہ و فقہاء سے اس کے جواز کا فتویٰ لینے کے لئے طرح طرح کی سختیاں کی گئیں۔ اس سلسلے میں امام مدینہ حضرت مالک بن انسؒ پر جو مظالم ڈھائے گئے وہ ہماری تاریخ کا ایک المناک باب ہیں۔ تاہم بعض حنفی فقہاء نے اس کا جواز تسلیم کیا ہے۔ لیکن موجودہ دور میں تمام اسلامی ممالک نے 'چاہے وہاں حنفی فقہ پر عمل ہوتا ہے یا کسی اور پر' اس کے مقاصد کے پیش نظر اسے قانوناً ختم کر دیا ہے۔ خود فاضل مؤلف فرماتے ہیں۔

"عراق، مصر، مراکش، اردن اور سوڈان میں طلاق مکرہ کو پارلیمان کے منظور کردہ قوانین کے تحت غیر واقع قرار دیا جا چکا ہے اور اس پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔" (صفحہ ۱۷۱)

عائلی قوانین میں طلاق دینے کا جو طریقہ مقرر کیا گیا ہے اس کی وجہ سے ہمارے ملک میں بھی یہ باب خود بخود بند ہو چکا ہے۔

لیکن فاضل مؤلف نے چونکہ عائلی قوانین کی کسی نہ کسی صورت مخالفت کرنی ہے اس لئے انہوں نے الفاظ کے ہیر پھیر سے اس باب کو دوبارہ کھولنے کی کوشش کی ہے اور طلاق بدعت کے بعد اس مسئلہ کو سب سے زیادہ اپنی توجہ کا مستحق سمجھا ہے اور پورے ۲۶ صفحات پر بحث فرمائی ہے۔ انہیں چونکہ معلوم تھا کہ ائمہ و فقہاء کی اکثریت اس کے سخت خلاف ہے اس لئے ان کی بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بھی دلی اطمینان

نہیں لیکن اس کے باوجود دفعہ نمبر ۱۰۵ میں کسی حد تک اس کا جواز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

"طلاق مکرہ (شخص مجبور کی طلاق) واقع نہ ہوگی جب طلاق دینے والے یا اس کے متعلقین کو غیر معمولی ضرر پہنچنے کا حقیقی خطرہ ہو۔ مگر لازم ہے کہ طلاق دینے والے شخص کی نیت طلاق دینے کی نہ ہو۔ (صفحہ ۳۸۴)

اس دفعہ میں بڑی صفائی سے طلاق مکرہ کے عدم وقوع کو غیر معمولی ضرر پہنچنے کے حقیقی خطرے سے مشروط کرکے اس کے جواز کی راہ نکال لی گئی ہے۔ کیونکہ جب بھی کسی کا مفاد اس طلاق کے وقوع سے وابستہ ہوگا، اس وقت آسانی سے یہ کہہ دیا جائے گا کہ غیر معمولی ضرر پہنچنے کا کوئی حقیقی خطرہ نہیں۔

حالانکہ بات بڑی سیدھی تھی۔ ایک چیز جو قرآن و سنت اور جمہور فقہاء کے مسلک کے خلاف تھی اسے سرے سے ختم ہی کر دینا چاہیئے جیسا کہ تمام اسلامی ممالک میں اسے قانوناً ختم کیا جا چکا ہے۔

شہادت طلاق

طلاق کی رُو سے علیحدگی کے وقت شہادت کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کا حکم دیا ہے۔ سورۃ الطلاق میں جہاں طلاق دینے کے طریقے کا ذکر ہے، وہاں یہ حکم بھی ہے۔ اشھدوا ذوی عدلٍ منکم و اقیموا الشھادۃ للّٰہ ۔۔۔ تم دو عادل اشخاص کو گواہ بنا لو اور اللہ تعالیٰ کے لئے گواہی قائم کرو۔

امام فخر الدین رازیؒ صاحب تفسیر کبیر نے اس قرآنی حکم کی تفسیر یوں کی ہے۔

الی امروا ان یشھدوا عند الطلاق و عند الرجعۃ ذوی عدلٍ منکم۔

(جلد ۳۰ - صفحہ ۳۴)

یعنی مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ طلاق دیتے وقت اور مطلقہ عورت سے رجوع کرتے وقت دو عادل گواہ بنا لو۔

لیکن قرآن مجید کو ہم نے زندگی کے دوسرے شعبوں میں کب اپنا رہنما بنایا ہے کہ اس قرآنی حکم کا خیال کرتے۔ اس قرآنی حکم کو بھلا دینے کی وجہ سے ہم نے اپنے آپ کو طرح طرح کی مشکلات میں پھنسا دیا جو اس حکم پر عمل کرنے سے وجود ہی میں نہ آتیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔

الاشھاد علی الرجعۃ وعلی الطلاق یرفع عن النوازل اشکالاً کثیرۃً۔

طلاق اور رجعت کے مواقع پر شہادت یعنی گواہی بہت سی پیچیدگیاں اور مشکلات رفع کر دیتی ہے۔

ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ اگر مسلمانوں سے اس قرآنی حکم پر لازماً عمل کرایا جاتا تو ملوکیت جتنا زور لگا لیتی طلاق بدعت اس حد تک مروج کرانے میں کامیاب نہ ہو سکتی کہ وہ طلاق سنت کی جگہ لے۔ یہ تمام تفصیلات فاضل مؤلف کے سامنے تھیں۔ وہ اس بارے میں بہت سے آثار و شواہد نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"ان آثار کے مطالعہ کرنے سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ طلاق رجعت میں شہادت کا "حکم" ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں۔ حضرت عمرؓ کے ارشاد کے مطابق رجعت کرنا یا بغیر شہادت کے طلاق دینا خلاف سنت ہے۔ اس بارے میں تمام ائمہ و فقہاء اہل سنت متفق ہیں۔" (صفحہ ۳۸۷)

لیکن اس قرآنی حکم کو "حکم" تسلیم کر لینے کے بعد فاضل مؤلف اسلامی قانون کی تدوین میں اس حکم کا جو حشر کرتے ہیں وہ انہی کی زبانی ملاحظہ ہو:۔

"ایقاع طلاق کے لئے شہادت شرط نہیں۔" (صفحہ ۳۸۴)

معلوم نہیں یہ حضرات قرآن کریم کے قریب آنے سے کیوں گھبراتے ہیں؟

بلوغ کی عمر کا تعین

بلوغت کی عمر کے تعین کے بارے میں یہ مبہم سا قانون بناتے ہیں۔

"عمر بلوغ کا تعین شریعت اسلامی کے مطابق ہوگا نہ کہ قانون بلوغ (MAJORITY ACT.) کے تحت۔" (صفحہ ۳۹۵)

لیکن اس کے بعد انہوں نے نہ تو یہ بتایا ہے کہ قانون بلوغ کے تحت بلوغت کی کیا عمر ہے۔ اور نہ ہی اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ شریعت اسلامی کا فیصلہ کیا ہے۔ ہمارے خیال کے مطابق عائلی قوانین میں امام ابن شبرمہ کی فقہ کے مطابق عمر کے تعین کے بعد قانون بلوغ کی قانونی حیثیت ختم ہو چکی ہے لیکن فاضل مؤلف نے یہ سارا معاملہ جان بوجھ کر مبہم بنا دیا ہے اور اس ابتدائی کڑی کے مبہم ہو جانے کی وجہ سے اس پر جو دیوار اٹھے گی اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوگی۔ عائلی قوانین میں بلوغت کی عمر کا تعین صغر سنی کی شادیوں کو ختم کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ اس پر ہمارے بعض علماء کو اعتراض ہے۔ اسلئے فاضل مؤلف اس بارے میں امام ابن شبرمہ کے مسلک کے دل سے قائل ہونے کے باوجود واضح بات کرنے سے کترا رہے ہیں۔

تفریق بسبب ظلم و ضرر

ہماری فقہ کی کتابوں میں طلاق کے مباحث پہلے ہی اتنی تفصیل سے پھیلے ہوئے ہیں کہ اسلامی فقہ کی تاریخ لکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں کہ یا اللہ یہ اتنی تفصیلات کہاں سے آگئی ہیں (محمد الخضری) لیکن ہمارے فاضل مؤلف ان تفصیلات پر بھی قناعت نہ کر سکے بلکہ ان میں اپنی طرف سے فقہ کے ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ اور وہ ہے "تفریق بسبب ظلم و ضرر" تفریق زوجین کا مسئلہ جتنا صاف ہے فاضل مؤلف اسے اتنا ہی الجھانے کی کوشش

کر رہے ہیں۔ جب شریعت اسلامی عورت کو اس کے حالات کے مطابق خاوند سے علیحدگی کا اختیار دیتی ہے تو اس نئے باب کے اضافے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن ہمارے فاضل مؤلف تو بیچاری عورت کو عدالت میں گھسیٹنے پر تلے ہوتے ہیں اس لئے یہ ایک علیحدہ اسلامی قانون تجویز فرماتے ہیں۔

"زوجہ اپنے شوہر کے ظلم و ضرر کے سبب بذریعہ عدالت تفریق طلب کرنے کی مجاز ہے۔" (ص ۲۳۹)

اس علیحدہ دفعہ کی تدوین سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلع محض کوئی کھیل تماشہ ہے۔ جو کوئی عورت تفریحاً حاصل کرتی ہے۔ اگر وہ مرد کے ظلم و ضرر کی وجہ سے علیحدگی چاہے گی تو شریعت نے اس کا کوئی دوسرا طریقہ مقرر کیا ہے جسے ایک نئے باب میں "تفریق بسبب ظلم و ضرر" کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نئے باب میں جو انہوں نے ۲۳ صفحات کی لمبی چوڑی بحث کی ہے وہ کتاب کا حجم بڑھانے کے سوا کوئی اور حیثیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ انہوں نے اس کے تحت جو تفصیلات اکٹھی کی ہیں وہ سب کی سب خلع سے متعلق ہیں اور فقہ کی کتابوں میں اسی عنوان کے تحت آتی ہیں۔

غیر ضروری تفصیلات

اس کتاب کی جس خصوصیت سے لوگوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ فقہ کی بڑی بڑی کتابوں کی طرح اس کا ضخامت حجم ہے۔ لیکن اگر غیر ضروری مباحث کو خارج کر دیا جائے تو حجم خاصا کم ہو جائے گا۔ مثلاً طلاق مکرہ (۲۵ صفحات)۔ طلاق عبید (۴ صفحات)۔ تفریق بسبب ظلم و ضرر (۲۳ صفحات) کو خارج کر دیا جائے تو کتاب کے موضوع پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اسی طرح طلاق بدعت کی ۴۷ صفحات کی بحث کو پانچ دس صفحات میں سمیٹا جا سکتا ہے۔ ہفت روزہ ایشیا بابت ۴ اگست ۱۹۶۸ء کے صفحہ ۱۰ پر جو تفصیلات شائع ہوئی ہیں اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے ایک صفحے کا اوسط خرچ کئی ہزار روپے بنتا ہوگا۔ اس لئے اگر اس اہم کتاب میں غیر ضروری تفصیلات سے احتیاط برتی جاتی تو زیادہ مناسب ہوتا۔

اصولِ تدوین کی تلاش

مجموعہ قوانین کی دونوں جلدوں کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد بھی ہم پر یہ واضح نہ ہو سکا کہ اسلامی قانون کی اس تدوین جدید میں کس اصول پر عمل کیا گیا ہے۔ اگرچہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ قوانین قرآن و سنت سے براہ راست مستنبط کئے گئے ہیں (صفحہ ۲۷)۔ لیکن جس طرح کا قرآن و سنت سے استنباط کیا گیا ہے۔ اس کی جھلک قارئین دیکھ چکے ہیں۔ اس کتاب کے جن اہم قوانین مثلاً خلع، طلاق بدعت، حلالہ، طلاق مکرہ، شہادت طلاق پر ہم نے تنقیدی نظر ڈالی ہے وہ سب کے سب نہ صرف اسلامی قانون کے سب سے بڑے اور متفقہ ماخذ قرآن حکیم کے خلاف ہیں۔ بلکہ سنت نبویؐ کے بھی خلاف ہیں۔ اور بعض تو ایسے بھی ہیں کہ فقہاء کے اجتہاد میں بھی ان کی

کوئی گنجائش نہیں جیسا کہ خلع کی بحث میں گذر چکا ہے کہ وہاں قرآن، حدیث اور فقہاء کے مسلک سب کو پس پشت ڈال کر رواج کو اسلامی قانون کی صورت میں اختیار کیا گیا ہے۔

قدامت پسندی سے جنگ

کتاب وسنت کے ساتھ یہ سلوک کرنے کے بعد اسلامی قانون کی تدوین جدید کے اس کارنامے کے بارے میں فاضل مؤلف فرماتے ہیں کہ انہیں قدم قدم پر بے جا قدامت پسندی اور روایت پرستی سے جنگ کرنی پڑی ہے (صفحہ ۲۰) ہمیں تو ان دونوں جلدوں میں کوئی ایسا مقام نظر نہیں آیا جس کے لئے کوئی ایسی جنگ لڑی گئی ہو۔ بلکہ یہ تو عین ان حضرات کی خواہش کے مطابق ہے۔ پہلے یہ لوگ عائلی قوانین کی زبانی مخالفت کر رہے تھے۔ فاضل مؤلف نے انہیں اس مخالفت کے لئے دلائل کے انبار مہیا کر دیئے ہیں۔ ان دونوں جلدوں کا موضوع عائلی زندگی ہے اور ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ عائلی قوانین کے ایک مخالف مودودی صاحب کی کتاب "حقوق الزوجین" اس مجموعہ سے کہیں بہتر ہے۔ لطف یہ کہ "حقوق الزوجین" کے مباحث سے عائلی قوانین کی تائید ہوتی ہے جبکہ کتاب زیر تبصرہ میں ان کی ایک ایک دفعہ کی مخالفت میں دلائل مہیا کئے گئے ہیں۔

تدوین کا کوئی اصول معین ہونا چاہیئے

حکومت کا یہ کام تو بڑا قابل ستائش ہے کہ اس نے اسلامی قانون کی تدوین جدید جیسے اہم کام کی طرف توجہ دی، لیکن جس طریقے سے اس کام کی ابتدا کی گئی ہے اس سے نہ تو یہ مقصد حاصل ہو سکیگا اور نہ ہی یہ حکومت کے لئے نیک نامی کا باعث بن سکیگا۔ مسلم معاشرہ کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے حکومت نے عائلی قوانین نافذ کئے جن میں کئی خامیاں بھی ہیں تاہم یہ کوئی نئی چیز نہیں تھی بلکہ دوسرے اسلامی ممالک میں برسوں پہلے رائج ہو چکی تھیں لیکن ہمارے ملک کے سیاسی حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ علماء نے اس اقدام کی مخالفت کی اور پھر جب حکومت ہی کے قائم کردہ اسلامی تحقیق کے ادارہ کے مشیر قانون ... ایک ایسی تحقیق کے ذریعے جو اکثر و بیشتر قرآن وسنت کے خلاف ہے ان مخالفین کے ہاتھ مضبوط کریں تو معاملہ کتنا مضحکہ خیز بن جاتا ہے۔ اسلئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تدوین کا کوئی اصول متعین کیا جائے اور پھر یہ کام اس کے مطابق سرانجام دیا جائے۔ ہمارے ذہن میں اسکی مندرجہ صورتیں آتی ہیں۔

ا۔ حنفی فقہ کیمطابق تدوین

اگر تو یہ تدوین حنفی فقہ کے مطابق کرنی ہے جس کی فاضل مؤلف نے اکثر و بیشتر صورتوں میں عملاً ناکام سی کوشش کی ہے، تو پھر ہمیں زیادہ تردد کی ضرورت نہیں۔ یہ کام مدت ہوئی مصر میں سرانجام پا چکا ہے اور اسے کتابی صورت میں "احکام الشریعۃ فی الاحوال الشخصیۃ علی مذھب الامام اعظم" کے نام سے متعدد بار

شائع کیا جا چکا ہے۔ اس چھوٹی تقطیع کی کتاب کے صفحات ایک سو سے بھی کم ہیں اور قیمت مبلغ چار روپے۔ اس کتاب میں وہ تمام مباحث آ گئے ہیں جو مؤلف نے اپنی دو بھاری بھر کم جلدوں میں پھیلائے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ شائع کر کے اگر مفت بھی تقسیم کر دیا جائے تو تمام اخراجات فاضل مؤلف کے مجموعہ کے ایک صفحے کے اوسط اخراجات سے بھی کم ہونگے۔

۲۔ کتاب و سنت کیمطابق تدوین دوسری صورت یہ ہے کہ تدوین کا کام عملاً اس اصول کیمطابق ہو جس کا مؤلف نے ذکر تو کیا تھا لیکن حتی الوسع عمل اس کے خلاف کیا ہے یعنی قرآن و سنت اور معتبر کتب فقہ سے استنباط کے ذریعے۔ یہ اصول بہترین ہے بشرطیکہ اس پر صدق دلی سے عمل کیا جائے لیکن اگر اس کام کو فرد واحد نے سرانجام دینا ہے تو اس سے کہیں مفید تر یہ صورت ہوگی کہ فقہ کی دو چار مستند کتابوں مثلاً بدایۃ المجتہد، نیل الاوطار، یا میزان الکبریٰ کے متعلقہ ابواب کا اردو ترجمہ شائع کرا دیا جائے۔ ان کتابوں کے مسائل نہ صرف یہ کہ عام طور پر کتاب و سنت کے مطابق ہیں، بلکہ اتنے قدیم ہونے کے باوجود فاضل مؤلف کے مجموعہ قوانین کی نسبت موجودہ زمانے کے تقاضوں سے زیادہ ہم آہنگ ہیں۔

۳۔ اہل علم کی مجلس تیسری صورت یہ ہے کہ یہ کام اہل علم کی ایک مجلس کے سپرد ہو۔ (مصر میں جب اس کام کی ابتدا کی گئی تھی تو اسی اصول پر، پہلی مجلس، جس نے یہ کام سنبھالا تھا، کے اراکین کی تعداد سولہ تھی جو مختلف طبقوں سے لئے گئے تھے) اور پھر یہ مجلس پاکستان کے جدید معاشرے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر کتاب و سنت کے مطابق اسلامی قانون کی تدوین جدید کرے۔

حرفِ آخر اسلامی قانون کی تدوین جدید کے کام کی اہمیت کی وجہ سے ہم نے زیر تبصرہ کتاب کو اپنی گہری توجہ کا مستحق سمجھا اور اس کام کو صحیح راستے پر چلانے کے لئے ہم نے مناسب تجزیئے کے بعد اپنا دیانتدارانہ مشورہ پیش کر دیا ہے۔ اس تجزیئے میں بعض مقامات پر تلخ حقائق سامنے لانے گئے ہیں لیکن اس سے مقصد اظہار حق ہے کسی خاص شخصیت کی مخالفت نہیں۔ خدا کرے کہ ہماری اس محنت اور کوشش کو اسی جذبہ سے دیکھا جائے اور اسلامی قانون کی تدوین جدید کے کام کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۲)

استدراک جیسا کہ ہم نے اس مجموعہ کی جلد اول پر تبصرہ کرتے وقت اشارۃً کہا تھا، ادارہ

تحقیقاتِ اسلامی کیطرف سے اس مہم کی افادیت ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس مجموعہ قوانین کی حیثیت حکومت کیطرف سے نافذ کردہ قانون کی نہیں۔ اسکی حیثیت نجی اور شخصی ہے۔ اگر اس سے مقصد یہ ہے کہ متعلقہ لوگوں کو قانونِ شریعت اور ملکی قانون ایک مجموعہ کی شکل میں یکجا مل جائے تو اس کتاب کو تالیف تک محدود رکھنا چاہیئے تھا۔ اپنی طرف سے کوئی رائے نہیں دینی چاہیئے تھی۔ اور اگر مقصد یہ تھا کہ اس سے حکومت کو "کتاب و سنت کے مطابق" قوانین وضع کرنے میں مدد ملے تو اس میں کوئی بات کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہونی چاہیئے تھی۔ موجودہ کوشش ہمارے نزدیک ملک کے غریب (TAX - PAYERS) کی مگر توڑنے سے زیادہ کوئی نتیجہ مرتب نہیں کر سکتی۔

اگر قرآن کریم کی رو سے دیکھا جائے تو طلاق سے متعلق ساری بحث چند فقروں میں سمٹ جاتی ہے یعنی

(۱) نکاح ایک معاہدہ ہے جو عاقل و بالغ مرد اور عورت کی باہمی رضامندی سے استوار ہوتا ہے۔ جو معاہدہ فریقین کی رضامندی سے استوار ہوا اسے فسخ کرنیکا حق فریقین کو یکساں حاصل ہوتا ہے۔ اسلئے مرد یا عورت جس وقت جی چاہے اس معاہدہ کو فسخ کر سکتے ہیں۔

(۲) چونکہ بعض اوقات انسان غصہ میں آکر جلد بازی سے ایک فیصلہ کر بیٹھتا ہے جس پر اسے بعد میں پشیمانی ہوتی ہے اس لئے اس باب میں قرآن کریم نے معاشرہ سے کہا کہ وہ میاں بیوی کی ناچاقی کی صورت میں مصالحت کی کوشش کرے۔ اگر مصالحت ہو سکے تو فبہا ورنہ انکا علیحدگی کا فیصلہ بحال رہے۔ اسے طلاق کہا جائیگا۔

(۳) چونکہ ایسا ہو سکتا ہے کہ (مثلاً) عورت دس ہزار روپیہ مہر وصول کر کے علیحدگی کا فیصلہ کرلے اور اسطرح مرد کو نقصان پہنچے اسلئے، ایسی صورتوں میں اس امر کا فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہوگا کہ عورت کی طرف سے علیحدگی کی صورت میں مرد کو کچھ ہرجانہ دلایا جائے یا نہ۔

(۴) ایک میاں بیوی کی علیحدگی کے بعد اس کا امکان باقی رہتا ہے کہ وہ دوبارہ نکاح کرلیں۔ اسی طرح ان کیلئے دوسری بار بھی اسکا امکان رہتا ہے۔ لیکن اگر ان میں تیسری بار اسی طرح علیحدگی ہو جائے تو پھر نکاح کی اجازت نہیں ہوتی (اسے تین طلاق کہتے ہیں) ہاں اگر اس عورت کا یہ نیا خاوند فوت ہو جائے یا اس سے علیحدگی کی نوبت آجائے تو پھر وہ پہلے خاوند کے نکاح میں آسکتی ہے۔

یہ ہیں طلاق کے قرآنی احکام[1] جنکا تفصیلی طریق کار متعین کرنا اسلامی حکومت کا فریضہ ہے۔ آپ غور کیجئے کہ کیا ان میں کوئی الجھاؤ، کوئی پیچیدگی، کوئی ابہام ہے جس کی وضاحت کیلئے آپ کو جلدوں پر جلدیں شائع کرنی پڑیں۔ (طلوع اسلام)

---

[1] معاملات سے متعلق قرآن کریم کے جملہ احکام پر پرویز صاحب کی ایک مختصر سی کتاب "قرآنی قوانین" میں یکجا کر دیئے گئے ہیں جو صرف تین روپے میں ادارہ سے مل سکتی ہے۔ (طلوع اسلام)

حقائق و عبر

۱۔ کون معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں؟

یہ بات ایک زبان زدِ خلائق ہے کہ جماعتِ اسلامی کا اسلام ہو یا اسکی سیاست، ان کٹھ پتلیوں کے تار کسی اور کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے سامنے لٹکایا ہوا پردہ ایسا دبیز ہوتا ہے کہ تماشا دیکھنے والوں کی نگاہ درونِ خانہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ بایں ہمہ، بعض اوقات، خود انکے نوکِ قلم پر ایسی باتیں آجاتی ہیں جن سے خود ہی پسِ آئینہ کی ایک جھلک سامنے آجاتی ہے۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان کے دوران جو روش اختیار کی، اسے کون بھول سکتا ہے۔ وہ عوامی تحریک تھی۔ پاکستان کا مطالبہ مسلمانانِ ہند کا جمہوری مطالبہ تھا۔ انہوں نے اسکی مخالفت کی۔ اس مخالفت کے پیچھے کس کا ہاتھ کارفرما تھا، یہ حقیقت انکی طرف سے غیر شعوری طور پر بے نقاب ہوگئی ہے۔ اگست ۱۹۶۹ء کے ترجمان القرآن کے "اشارات" میں کہا گیا ہے کہ جب انگریز نے دیکھا کہ وہ ہندوستان سے جا رہا ہے تو اس نے ایسا انتظام کیا جس سے اہلِ پاکستان کے دل میں اپنی قومیت کا جذبہ بیدار نہ ہونے پائے۔ جس کے لئے اس نے ایک طبقہ تیار کیا جس نے

> اس ملک کو تباہ کرنے کے لئے تین دائروں میں کام کیا۔ پہلے دائرے میں اس امر کی کوشش کی گئی کہ ملک میں جمہوری نظریات و اقدار ترقی نہ کرنے پائیں کیونکہ ان کے ترقی پانے سے اقلیت اکثریت پر اس کی مرضی کے علی الرغم مسلط نہیں رہ سکتی۔ یہاں تخلیقی اقلیت (CREATIVE MINORITY) کا فلسفہ گھڑا گیا اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھائی جانے لگی کہ اس ملک کے عوام میں ابھی اس قدر سیاسی شعور موجود نہیں ہے کہ وہ اپنے لئے اپنے حکمران منتخب کر سکیں۔ اسلئے عوام کالانعام کو ترقی کے راستے پر گامزن رکھنے کے لئے صحیح صورت یہی ہے کہ ایک مختصر سی اقلیت کے ہاتھ میں ان کی نکیل تھما دی جائے اور اسے یہ آزادی دیدی جائے کہ وہ انہیں جس طرف چاہے لے جائے۔

یعنی انگریز کا منشا یہ تھا کہ عوام کے ذہنوں میں یہ بات راسخ کر دی جائے کہ انہیں قطعاً سیاسی شعور حاصل نہیں۔ ان کی ذہنی سطح بہت پست ہے۔ انہیں اپنی باگ ڈور ایک اقلیت کے ہاتھ میں دیدینی چاہیئے جو انہیں صحیح راستے پر چلائے۔ یہ تھی انگریز کی پالیسی۔ سوال یہ ہے کہ اس پالیسی کو بروئے کار کون لا رہا تھا؟ ظاہر ہے کہ مسلم لیگ تو یہ بات

کہہ ہی نہیں سکتی تھی جس کے تو دعویٰ کی بنیاد ہی اس حقیقت پر تھی کہ مسلمان عوام پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس مودودی صاحب کیا خیالات پھیلا رہے تھے، غور سے سنیئے۔ ان کا ارشاد تھا۔

یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے (۹۹۹) فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔۔۔۔ انکی اکثریت کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلیگی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔ (ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۵۶ھ)

اور سنیئے:۔

غرض آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لینگے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا مسلمان نظر آئیگا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کر سکینگے۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیلیں، کوّے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک چڑیا ہے کیونکہ چڑیا گھر میں داخل ہیں۔ (ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ)

جمہوریت سے مراد قوم کی اکثریت کی آواز ہے۔ اس سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں۔

بعض لوگ اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کا نام "سوادِ اعظم" ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ "سوادِ اعظم" کا ہمیشہ ساتھ دو۔ لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت جس سیاسی پالیسی کی حامی اور جس قیادت کی متبع ہے اسکے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ لیکن یہ ارشادِ نبوی کی سراسر غلط تعبیر ہے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے جس سوادِ اعظم کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے اس سے مراد دراصل ان مسلمانوں کی اکثریت ہے جن کے اندر اسلامی شعور موجود ہو، جو حق و باطل کی تمیز رکھتے ہوں اور جن کو اسلام کی روح اور اس کے بنیادی اصولوں سے کم از کم اتنی واقفیت ضرور ہو کہ اسلام اور غیر اسلام میں فرق کر سکتے ہوں۔ (ایضاً)

غرضیکہ وہ "اٹھتے بیٹھتے" دن رات، مسلمانوں کی اکثریت کے ذہنوں میں اس خیال کو راسخ کرتے چلے جاتے تھے کہ تم ناکارہ ہو، بیکار ہو، نااہل ہو، بے شعور ہو۔ کبھی کہتے کہ

"ان وجوہ سے وہ عظیم الشان تعداد جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے اسلامی اغراض کے لئے قریب قریب بیکار ہو چکی ہے۔" (ایضاً)۔ کبھی یہ کہ "یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔" (ایضاً)

یہ تھا انگریز کی تجویز کردہ پالیسی کا پہلا حصہ۔ یعنی اکثریت کو اسکی نگاہوں میں ذلیل کر دو۔ اب رہا دوسرا حصہ ۔۔۔ کہ

انہیں بتاؤ کہ تمہاری فلاح و بہبود کا راز اسی میں ہے کہ تم اپنی باگ ڈور ایک اقلیت کے ہاتھ میں دیدو۔ اس کے لئے مودودی صاحب وعظ فرمانے لگے کہ۔

جو جماعتیں کسی طاقتور نظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اٹھتی ہیں وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہوتی ہیں اور قلتِ تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اس وقت صرف ۳۲ لاکھ ہے اور انقلاب کے وقت اس سے بہت کم تھی۔ مگر اس نے ۱۷ کروڑ انسانوں کو مسخر کر لیا۔ مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف ۴ لاکھ ارکان پر مشتمل ہے اور روم پر مارچ کرتے وقت ۳ لاکھ تھی۔ مگر یہ قلیل تعداد ساڑھے چار کروڑ اطالوی باشندوں پر چھا گئی۔ یہی حال جرمن نازی پارٹی کا ہے۔ اگر قدیم زمانے کی مثالیں خود اسلامی تاریخ سے دی جائیں تو ان کو یہ کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے کہ وہ زمانہ گزر گیا اور وہ حالات بدل گئے۔ لیکن یہ تازہ مثالیں آپ کے اسی زمانے کی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اقلیت آج بھی حکمران بن سکتی ہے بشرطیکہ وہ اسی طرح مجاہدہ کرے جس طرح ایک اصول اور مسلک رکھنے والی جماعت کیا کرتی ہے۔ (ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ)

یوں انگریز کی تجویز کردہ پالیسی کو کامیاب بنانے کے لئے جماعتِ اسلامی آگے بڑھی۔ سچ فرمایا تھا حکیم الامت نے کہ

چنیں دور آسمان کم دیدہ باشد — کہ جبریل امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا — پرستد مومن و کافر تراشد

انگریز چلا گیا۔ اس کے ساتھ وابستگیاں بھی ختم ہو گئیں۔ اب کرسی پرستوں کے لئے نئی فضاؤں کی تلاش ہوئی۔ ظاہر ہے کہ انگریز کے اقتدار کے مائل بہ زوال ہونے کے بعد استعماری قوتوں میں امریکہ کا مقام سب سے بلند تھا۔ لیکن اس کے سامنے سب سے بڑا خطرہ کمیونزم کا سیلاب تھا۔ ۱۹۵۵ء کی بات ہے کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کا رخ خود امریکہ کی سمت ہو رہا تھا۔ عین اس زمانے میں مودودی صاحب نے کراچی میں ایک پبلک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

اگر یہ بلاک فی الواقعہ یہ چاہتا ہے کہ کمیونزم کی روک تھام کے لئے اسے مسلم عوام کا دلی تعاون حاصل ہو تو اسے اپنی بنیادی پالیسی میں بنیادی تغیر کرنا پڑیگا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اسے مسلم ممالک کے حکمرانوں سے ساز باز کرنا ہے یا مسلم ممالک کے عوام کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ یہ اس کے سوچنے کا کام ہے کہ اسے کونسی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ اسے ان حکمرانوں کی ضرورت ہے جو عوام پر سطحی اثر بھی نہیں رکھتے یا عوام کے تعاون کی ضرورت ہے جو طاقت کا اصل سرچشمہ ہوتے ہیں۔ پچھلی جنگِ عظیم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ

۱؎ اس وقت چین کی کمیونسٹ پارٹی ہنوز برسرِ اقتدار نہیں آئی تھی اس لئے اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ (طلوعِ اسلام)

حکومت خواہ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو پوری طاقت نہیں لگا سکتی جب تک ملک کے باشندے اس جنگ کو اپنی جنگ نہ سمجھیں۔ (تسنیم۔ ۱۶؍ دسمبر ۱۹۵۵ء)

اس کے بعد انہوں نے لاہور کے جلسہ عام میں اپنی تقریر میں اسے ان الفاظ میں دہرایا کہ

اس سلسلہ میں دوسری بات یہ ہے کہ خود اینگلو امریکی بلاک کو بھی سوچنا چاہیئے کہ اگر وہ صرف مسلمان حکمرانوں سے معاملہ کرنا چاہتا ہے اور اسکو مسلمان عوام کے ساتھ کوئی معاملہ نہیں کرنا ہے تو الگ بات ہے لیکن اگر اسکی خواہش یہ ہے کہ مسلمان ممالک کے عوام بھی اس کے ساتھ تعاون کریں تو اس معاملہ میں ہمیں وضاحت کے ساتھ یہ بتا دینا چاہیئے کہ مسلمان ملکوں کے ساتھ آپ کی جو پالیسی چلی آرہی ہے وہ ایسی ہرگز نہیں ہے کہ پاکستان اور دوسرے ممالک کے عوام کا دلی تعاون حاصل ہو۔ (تسنیم۔ ۲۰؍ دسمبر ۱۹۵۵ء)

یعنی وہی عوام جو اس وقت بالکل بیکار، فرسودہ، اور ناکارہ تھے، اب اصلی قوت کا سرچشمہ بن گئے۔ اب یہ جنس کاسد نہ رہی، متاعِ گراں بہا بن گئی۔ ظاہر ہے کہ امریکہ کو "کمیونزم کی روک تھام کے لئے" تعاون کی ضرورت تھی — اور اشد ضرورت — اور ان کا یہ تعاون انہی کی وساطت سے حاصل ہو سکتا تھا جو انہیں یہ باور کرا دیں کہ وہ عوام کے نمائندہ ہیں۔ اس مقصد کے ماتحت اب جمہوریت — یعنی اسی بیکار، فرسودہ، بے شعور، اخلاق باختہ، اسلام سے بیگانہ قوم کی اکثریت کی آواز — عین اسلام قرار پا گئی۔ اب یہ وہ "سوادِ اعظم" بن گئی جس کے ساتھ دینے کا ارشاد نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ اس وقت کہا گیا تھا کہ روس کی کمیونسٹ جماعت کی اقلیت کو یہ حق حاصل تھا — اور ان کا یہ حق عین اسلام کی تعلیم کے مطابق تھا — کہ وہ اکثریت پر حکومت کرے۔ اب کمیونسٹ ممالک کی یہی پالیسی، آمریت کا ابلیسی نظام قرار پا گئی جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ اس وقت "جمہوریت کی رو سے قائم کردہ حکومت مسلمانوں کی کافرانہ حکومت" قرار پاتی تھی۔ (ترجمان القرآن۔ بابت محرم ۱۳۶۶ھ) اب جمہوری حکومت اسلام کا بنیادی تقاضا قرار پا گیا۔ اس لئے کہ اب اگر عوام کے "انبوہِ عظیم" کو جنس کاسد قرار دے دیا جائے تو اس کی قیمت فروخت ملنے لگی کیا؟ امریکہ سے تو کہا ہی یہ گیا تھا کہ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ تم مسلمان ممالک کے عوام کا تعاون حاصل کرو۔ ان کے نمائندے ہم ہیں۔ اس لئے اب جس قدر عوام کی اہمیت بڑھائی جائے گی اسی قدر انکی "اون" کے دام زیادہ ملیں گے۔ دنیا کا ہر کاروباری یہی کچھ کرتا ہے۔ لیکن قرآن کے بازار بیع و شریٰ سے یہ آواز بلند ہوتی ہے کہ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ (۲/۱۶) اس قسم کا کاروبار آخر الامر کبھی منفعت بخش ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن اس آواز کو وہی شخص سن سکتا ہے جس کے کانوں میں مفادِ خویش کے ڈاٹ نہ لگ چکے ہوں۔

خورشید عالم

ترکی کا عالمی کردار

ترک تاریخ کا ثانوی سا کردار ہے۔ اس کے متعلق جو کہہ دیا جائے، جو فرض کر لیا جائے، اس کا غالب امکان ہے کہ تحقیق سے وہ خوبی مبنی بر حقیقت ثابت ہو گی۔ اس کے ظاہر اور باطن کا اثر اتنا گہرا ہے کہ ترک خوبصورت، تنومند اور بہادر کا ہم معنی ہو گیا۔ گو ترکی اثر زمانہ قدیم سے ہے اور ایشیا میں ہمہ گیر اور یورپ میں نمایاں ہے، تاہم یہ موقع اس حیرت انگیز مگر دلکش تفصیل میں جانے کا نہیں۔ ترک کا ہمارے ہاں عام تصور اسلام کے بازو تنے شمشیر زن اور خلیفۃ المسلمین کا ہے۔ اس صدی کے شروع میں یہ ترک ہماری سیاست کا محور تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ اس ترک سے یورپ لرزہ براندام رہتا تھا اور اس کی سلطنت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ یورپ کے لئے خشکی کے راستے اس حد تک مسدود ہو گئے تھے کہ اسے اپنی استعماری ضرورت کے لئے سمندروں کا رخ کرنا پڑا۔ اور ترکوں سے بچ کے ایشیا اور افریقہ تک پہنچنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جس ترک سے یورپ راستہ نہیں لے سکتا تھا اسے اس نے تاریخ کی نصابی کتابوں میں لٹیرا کہا۔ اور اسے اپنا کارنامہ ثابت کیا کہ لٹیروں سے بچتے بچاتے وہ سمندری راستوں سے ملکوں میں استعمار کا زہر پہنچانے اور پھیلانے میں کامیاب رہا۔

یہ زہر ترکی سلطنت میں بھی سرایت کرتا گیا اور ایک وقت آیا کہ سلطنت زہرناک ہو کر تاریخ کے اوراق میں مدفون ہو گئی۔ ترکی یا عثمانی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو اس کے بطن سے نیا اور موجودہ ترکی نمودار ہوا۔ موت اور زندگی کا یہ کھیل کھیلا ہی جانا چاہئیے تھا۔ سلطنتیں اپنا تاریخی جواز کھو بیٹھی تھیں اور قومی اور انسانی خودی کے منافی ہو چکی تھیں۔ پہلی عالمی جنگ کی آگ سلطنتوں ہی کے طفیل بھڑکی تھی اور اس میں متعدد سلطنتیں خاکستر ہو گئی تھیں۔ ترکی اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ سلطانی اور سامراجی نظم سیاسی سے نجات پا گیا اور نوجوان ترکوں کی حریت پرور جد و جہد سے جمہوریہ ترکیہ معرضِ وجود میں آ گیا۔ فرسودہ ترکی کی موت اور جمہوریہ ترکی کی پیدائش ولولہ خیز اور عبرت انگیز داستان ہے لیکن اس تفصیل کا بھی یہ موقع نہیں۔ ترکی جدید (جمہوری) دور میں داخل ہوا تو یہ خالی الذہن تھا۔ ترک جاں پرور جد و جہد سے سلطانی دور سے نکل کر جمہوری دور میں داخل

ہوگئے لیکن نئے دور میں ان کی تمام تر مجاہدانہ تگ و تاز ان کی کوئی راہنمائی نہ کر سکی۔ ترک مسلمان ہی نہیں خلیفۃ المسلمین تھے۔ ان کے دور جدید میں داخل ہونے سے خود اسلام دور جدید میں داخل ہو گیا۔ یہ پہلا مسلمان ملک تھا جو نئے دور میں داخل ہوا تھا۔ لیکن جہاں ترک اپنی جد و جہد سے آگے نکل آئے وہاں ان کا تصورِ اسلام ملّایانہ رہا۔ ان میں تفکر کا سلسلہ تو شروع ہو گیا لیکن وہ ان کی سیاسی جد و جہد کی تیز رفتاری کا ساتھ نہ دے سکا۔ چنانچہ خلافت کے خاتمے پر جمہوریت کا قیام عمل میں آیا تو ترکوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ دستور بھی جمہوری اور ترقی یافتہ یورپ سے ادھار لے آئے۔ یہ ان کی قومی زندگی میں اتنا بڑا تضاد تھا جس سے ان کی انقلابی تحریک بیداری آگے بڑھنے سے قاصر رہ گئی۔

ترکی نے اپنی جد و جہد سے سلطانی کا خاتمہ کیا تھا اور جمہوریت کا راستہ اختیار کیا تھا۔ جمہوریت کا صحیح مفہوم جمہور یعنی عامۃ الناس کی فلاح و بہبود ہے۔ لیکن یورپ نے اپنے نام نہاد جمہوری نظام کا ایسا جادو چلا رکھا ہے کہ جمہوریت کا راستہ اختیار کرنے والے نئے ممالک یہ راز پانے اور تمام تر توجہ عامۃ الناس پر مرکوز کرنے کی بجائے یورپ کے نظم سیاسی کو اختیار کر لینے کو ہی جمہوریت کی معراج سمجھتے ہیں۔ یورپ کا نظم سیاسی صرف دیکھنے میں جمہوری ہے۔ یہ سرتاسر استحصالی اور استعماری ہے۔ اسے عوام دشمن کہنا زیادہ صحیح ہے۔ مغربی ممالک کے تمام تر دعووں کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ان کا جمہوری نظام مراعات یافتہ طبقات کو بالادست بناتا اور بنائے رکھتا ہے۔ دوسرے طبقات زیردست اور ان کے رحم و کرم پر ہوتے اور رہتے ہیں۔ جب مغرب کا استعمار دنیا بھر میں پھیل رہا تھا اس وقت مغربی ممالک کے استحصالی نظام کی کارفرمائی نمایاں نہیں ہوئی تھی کیونکہ استعماری لوٹ جملہ طبقات معاشرہ تک حصہ رسدی کے طور پر پہنچ جاتی تھی اور گو بالائی طبقات ہی اس سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھاتے تھے تاہم نچلے طبقے اپنے آپ کو محروم نہیں سمجھتے تھے۔ اب جب استعمار پسپا ہو رہا ہے اور استعماری لوٹ کی آمدنی محدود ہونے لگی ہے مغربی ممالک کے اندر استحصال نمایاں ہونے لگا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی ممالک میں خلفشار و ہیجان ہی نہیں بڑھ رہا طبقاتی تصادم بھی شدید ہو رہا ہے۔ گویا اب یہ راز مغربی ممالک پر کھلنے لگا ہے کہ جس ظالمانہ سرمایہ دارانہ نظام کو وہ فطرتِ انسانی کا فطری تقاضا سمجھتے اور سمجھاتے چلے آئے ہیں اس کا دور ختم ہو گیا ہے اور وہ اس عالمی فتنہ و فساد کا ذمہ دار بن گیا ہے جو خود قوموں کے اندر بھی برپا ہے اور قوموں قوموں کے درمیان بھی۔ یہ راز اب جمہوریت کے خواہشمند ممالک پر بھی کھلتا جا رہا ہے اور انہیں پتہ چلتا جا رہا ہے ۔ یورپی ممالک کی مثال سے بھی اور ان حالات سے بھی جو ان کے اپنے ہاں پیدا ہو گئے ہیں ۔ کہ جمہوریت سے مراد مغرب کا ابلیسی سرمایہ دارانہ نظام نہیں بلکہ معاشرے کی ایسی تشکیل نو ہے جو انسانی اقدار کو فروغ دے اور جملہ انسانی معاشرہ کی صلاحیتوں کو یکساں طور پر بروئے کار لانے کا موجب ہو۔ زمانہ اس راز کی گرہیں تو کھولتا

جارہا ہے لیکن ذہن انسانی نے اپنے طور پر فکر و عمل میں جو گرہیں لگا رکھی ہیں وہ کھلتے کھلتے کھلیں گی۔ ایشیائی اور افریقی ممالک یہاں آکر ڈور کو اس انداز سے سلجھانے لگے ہیں کہ بعض کو سرا ملتا دکھائی نہیں دیتا۔ مغرب دیوانہ وار اس کوشش میں ہے کہ یہ سرا زیادہ سے زیادہ دیر تک نہ ملے۔

اقبالؔ نے جدید ترکی کے بارے میں بڑے بلیغ انداز سے کہا تھا ؎

سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا
ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب

جدید ترکی کی ساری کشمکش کا راز اسی میں ہے کہ اس نے یورپ کو ہم جوار سمجھا۔ اس نے یورپ کی اداؤں کو تو پیش نظر رکھا لیکن آئینہ ایام میں اپنی ادا نہ دیکھ سکا۔ دو وجہیں خاص طور پر اس کا سبب بن گئیں۔ ایک، ترک سیاسی جد و جہد اور عسکری تگ و دو سے جمہوری دور تک آپہنچے۔ انہوں نے یہ جرأت تو کر لی کہ خلافت کا خاتمہ کر دیا لیکن اس کی جگہ فکرِ اسلامی سے کوئی جداگانہ نظم سیاسی و معاشی متشکل نہ کر سکے۔ برق رفتار انقلاب سیاسی نے انہیں اس کا موقعہ ہی نہ دیا اور انہوں نے افراتفری یا عجلت میں یورپ کا ساختہ اور آزمودہ نظام اپنا لیا۔ یورپ کی طرف متوجہ ہونے کی دوسری وجہ روس بن گیا۔ یہ وجہ بھی دوہری تھی۔ ایک، روس ترکی کا دیرینہ دشمن چلا آرہا تھا۔ ترکی اس دشمن کی طرف یقیناً رجوع نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے، ترکی جمہوریت تک پہنچا تو روس ایک ایسے انقلاب سے دوچار ہو چکا تھا جس کے نتائج کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یوں ایک تو روس سے دشمنی کی وجہ سے اور دوسرے اس خیال سے کہ روس ترکی کے لئے نمونہ نہیں بن سکتا، ترکی یورپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے اپنا دستور بھی یورپ سے لیا اور جمہوریت کا تصور اور نظام بھی اسی کا لیا۔ دوسری جنگ کے بعد ترکی یورپ کی طرف اور زیادہ متوجہ ہی نہیں ہو گیا بلکہ ایک حد تک یورپی ہی بن گیا۔ اس نے یورپی مملکت کی حیثیت سے نیٹو کی رکنیت اختیار کر لی۔

ایسے ترکی کی امریکہ کو خاص طور پر ضرورت تھی۔ اسے روس کے خلاف ایک قریبی اڈہ بھی مل گیا اور پاکستان تک پہنچنے کا راستہ بھی۔ امریکہ نے اپنی استعماری غرض کے لئے اس ملک پر خصوصی توجہ صرف کی۔ اس میں اپنے اڈے قائم کئے اور اسے فوجی اور اقتصادی امداد بڑی سخاوت سے دینے لگ گیا۔ روس کے خلاف ترکی میں امریکہ نے جو اڈے قائم کئے ان کا سلسلہ وسیع کرتے کرتے پاکستان تک لے آیا۔ اس پر اس نے علاقائی اور اسلامی تعاون کا ملمع چسپاں کیا اور اسے زیادہ سے زیادہ خوشنما بنانے کی کوشش کی۔ اسی راستے اس نے عالم عرب میں بھی نفوذ کرنے کی طرح ڈالی۔ وہ ایک وقت بغداد تک بھی پہنچ گیا لیکن آگے بڑھنے کی بجائے اسے پیچھے ہی لوٹنا پڑا۔ پاکستان میں بھی وہ اڈہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اسے سنٹو (سابقہ معاہدہ بغداد) کے ذریعہ

ایک حد تک نیٹو کے ساتھ منسلک کر لیا اور پھر نیٹو کا سلسلہ سیٹو کے ذریعہ جنوب مشرقی ایشیا تک پہنچا دیا۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن پاکستان امریکہ کے خلافِ اشتراکیت اقدامات سے دور ہی رہا اور اس کے استعماری عزائم کا آلۂ کار نہ بن سکا۔

پاکستان کے امریکہ کا آلۂ کار نہ بن سکنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ امریکہ کے خلافِ چین اقدامات کے لئے بھارت نے اپنے آپ کو بڑے فدایانہ طریق سے پیش کر دیا۔ اس سے امریکہ کی دلی مراد بر آتی اور اس نے بھارت پر سازوسامانِ جنگ اور پیسے کی بارش شروع کر دی۔ صدیوں کے تاریخی تصادم سے پاکستان یہ نتیجہ نکالے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ امریکہ جس سانپ کو چین کے لئے پال رہا تھا وہ سب سے پہلے اسے کاٹے گا۔ بھارت ایسے روایتی دشمن کی بے دریغ پرورش کو دیکھ کر پاکستان امریکہ کی دوستی کے فریب میں نہیں آ سکتا تھا اور نہیں آیا۔ پاکستان نے امریکہ سے فوجی معاہدہ بھی کیا، اس کی سنٹو اور سیٹو جیسی نام نہاد دفاعی تنظیموں میں بھی شریک ہوا۔ اور ایک وقت تک اسے فوجی اڈہ[1] بھی دے دیا۔ اس سے پاکستان میں امریکہ کے اثر و نفوذ اور دباؤ کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تصور کرنا مشکل نہیں کہ یہ اثر اور دباؤ کس حد تک استعمال کیا گیا ہوگا۔ نو آزاد ممالک کی حکومتیں ایسے دباؤ کا مقابلہ آسانی سے نہیں کر سکتیں۔ پاکستان کی بھارت فہمی اور سامراج دشمنی کا یہ کمال ہے کہ کوئی حکومت اس دباؤ میں آ کر کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکی جو پاکستان کو بھارت کا ضمیمہ اور امریکہ کا آلۂ کار بنانے کا موجب ہوتا۔ اس ملک میں "شمالی خطرے" کی بھی باتیں ہوئیں۔ شمالی خطرے کے خلاف اشتراکیت کے شوشے بھی چھوڑے گئے۔ مگر چین اور پاکستان کے درمیان نہ بھارت حائل ہو سکا نہ امریکہ۔ حائل ہوا تو امریکہ اور چین کے درمیان پاکستان حائل ہوا۔ بھارت اور چین کے درمیان بھی ایک حد تک پاکستان ہی حائل ہے۔

امریکہ کا یہ کردار ترکی کی آنکھیں کھولنے کے لئے کم نہ تھا کہ اس کے اپنے ہاں بھی امریکی موجودگی گل کھلانے لگی۔ ترکی کو امریکہ کی طرف سے فوجی امداد دو طرح سے ملنے لگی۔ براہ راست بھی اور نیٹو کے ذریعے بھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترکی کو آہستہ آہستہ یہ احساس ہونے لگا کہ وہ امریکہ کے قبضے میں آتا جا رہا ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہو گئی۔ اس سلسلے میں جو امریکی ترکی میں متعین ہونے لگے ان کی تعداد چھبیس ہزار تک پہنچ گئی اور اس سے ترکی معاشرے میں طرح طرح کے مفاسد پیدا ہونے لگے۔ امریکی شہزادوں کی طرح رہتے ہیں اور انہیں رہائش، خرید و فروخت، عیش و عشرت کی ہر طرح کی آسانیاں حاصل ہیں۔ ان کا اخلاقی معیار نہ اپنے ملک میں قابلِ توصیف ہے نہ دوسرے ملک میں ایسا ہوتا ہے۔ ترکوں نے یہ بھی دیکھا کہ جو امریکی سفیران کے ہاں آتے

---

[1] پشاور کے نزدیک بڈابیر کا اڈہ ۱۹۵۹ء میں امریکہ کو دیا گیا تھا لیکن اس سال ۱۹۶۹ء میں اسے ختم کر دیا گیا ہے۔

ہیں ان کا زیادہ تر تجربہ "سی۔ آئی۔ اے" اور ویٹ نام کا ہوتا ہے۔ یہ کچھ دیکھ کے وہ سوچے بغیر نہ رہ سکے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور سوچ کر یہ احتجاج کئے بغیر نہ رہ سکے کہ یہ کیوں ہو رہا ہے۔ قبرص کے معاملے میں بھی ترکی کو امریکہ کا اچھا تجربہ نہیں ہوا۔ قبرص کا مسئلہ بلا واسطہ نہیں تو بالواسطہ ترکی اور یونان کا مسئلہ ہے۔ دونوں کی عداوت دیرینہ ہے۔ اسی قدر دیرینہ مغرب کی ترکی دشمنی اور یونان دوستی ہے۔ قبرص کے قضیے میں امریکہ نے یہ کوشش تو نہ کی کہ نیٹو کے ان دو ارکان میں مفاہمت کی فضا قائم ہے اس نے الٹا ترکی کا راستہ روکا۔ ۱۹۶۳ء میں فضا اتنی مکدر ہو گئی تھی کہ ترکی کا بحری بیڑہ قبرص پر حملہ کرنے کے لئے حرکت میں آگیا تھا۔ اس پر امریکہ کا بحر روم کا بیڑہ بھی حرکت میں آگیا اور اس نے ترکی کو کسی قسم کی کارروائی کرنے سے روک دیا۔ یہ ترکی کے حلیف امریکہ کی صریح ترکی دشمنی اور یونان نوازی تھی۔

جیسے پاکستان نے تجربے سے دیکھا کہ امریکہ کا دوستی کا یہ تصور ہے کہ اس کے دوست اس کے طفیلی بن جائیں اور اس کے استعماری اقدامات کے لئے آلہ کار کے طور پر کام آئیں اسی طرح ترکی نے بھی دیکھا کہ امریکہ کی دوستی کا اعتبار نہیں۔ چنانچہ اس نے آزادانہ طور پر سوچنا شروع کر دیا۔ اس کے باوجود کہ امریکہ کی طرف سے اسے فوجی امداد مل رہی ہے وہ اپنے دفاع میں خود کفیل ہونے کے منصوبے بنانے پر آگیا ہے۔ امریکہ کی حرکات کی وجہ سے ترکی رائے عامہ شدت سے امریکیوں کے خلاف ابھرنے لگی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر ہنگامے ہوتے ہیں اور وہ شدت اختیار کر جاتے ہیں۔ ان ہنگاموں اور مظاہروں میں طلبا پیش پیش ہیں۔ عام ترک بھی اس سے غیر متاثر نہیں۔ چنانچہ احتجاج پھیلتا جا رہا ہے اور ہمہ گیر ہوتا جا رہا ہے۔ خود امریکی تسلیم کرنے لگے ہیں کہ احتجاج انتہا پسندوں ہی تک محدود نہیں رہا۔ یہ مظاہرے اس حد تک منفی ہیں کہ وہ امریکہ اور اس کی سامراجی حرکتوں کے خلاف ہیں لیکن اس حد تک مثبت ہوتے جا رہے ہیں کہ ترکوں کی نظریں اپنے آپ پر مرکوز ہونے لگی ہیں۔ یہ اس لئے بھی ہو رہا ہے کہ جو سیاسی، معاشرتی اور معاشی اقدامات کئے جاتے رہے ہیں ان کے نتائج بھی سامنے آنے لگے ہیں۔ اور ترک یہ سوچنے پر مجبور ہوتے جا رہے ہیں کہ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کو اپنا کر وہ راستے سے بھٹک گئے۔

یورپ کے تتبع میں ترکوں نے پارلیمانی حکومت کا تجربہ اس انداز سے کیا کہ حکومت ہی سے چند افراد الگ کر کے حزب اختلاف بنائی گئی۔ بظاہر یہ اقدام کامیاب رہا اور حزب اختلاف کا وجود قائم ہو گیا۔ لیکن اس سے کوئی ایسا نظم سیاسی ابھر نہیں سکا جو ترکوں کی امنگوں کی تسکین بہم پہنچاتا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ مغرب کے نام نہاد جمہوری طرز حکومت میں، وہ پارلیمانی ہو تو، اور صدارتی ہو تو، سیاست ایک حکمران طبقے میں محدود ہو جاتی ہے۔ یہ طرز حکومت اس اعتبار سے جمہوری ہوتا ہے کہ وہ بالغ افراد سے ووٹ حاصل کرتا

ہے لیکن اس اعتبار سے بالکل غیر جمہوری ہوتا ہے کہ وہ اقتدار کو چند ہاتھوں میں سمیٹ کر رکھ دیتا ہے۔ سیاسی جماعتیں بالائی طبقات ہی کی ترجمان ہوتی ہیں اور عوام کے مفاد سے عملاً پہلو تہی کرتی ہیں۔ جس جس ملک نے بھی اس طرز حکومت کو اپنایا وہ بالآخر گھاٹے میں رہا۔ ترکی میں فوج تک نے مداخلت کی۔ جو فوج صدیوں سے اسلام کا بازوئے شمشیر زن رہی اس نے ۱۹۲۳ء کے بعد سے اب تک کم و بیش نصف صدی میں کوئی لڑائی نہیں دیکھی۔ صرف چند سپاہی امریکہ کے ایما پر کوریا گئے اور لڑے لیکن اسے ترکی کی لڑائی نہیں کہا جا سکتا، نہ یہ ترکی کی کوئی قابل ذکر لڑائی تھی۔ یہ فوج سیاست میں مداخلت کر کے ایک طرح کا توازن تو برقرار رکھ سکی لیکن ان مسائل کا حل تلاش نہیں کر سکی جس سے عوام دوچار ہیں اور جو دن بدن سنگین ہوتے جا رہے ہیں۔

ترکی ایک زرعی ملک ہے۔ دیہاتی پسماندہ ہیں۔ وہ بے کار بھی ہیں اور کم کار بھی۔ جمہوری دور سے پہلے فوج کی ملازمت ان کے لئے آمدنی کی صورت ہوتی تھی ..... ترکی کو اکثر لڑائیاں لڑنی پڑتی تھیں اس لئے فوج میں بھرتی کی ضرورت عام ہوتی تھی۔ اب یہ صورت نہیں رہی۔ مسلسل امن کی وجہ سے گاؤں والوں کے لئے ملازمت کی یہ صورت یقینی نہیں رہی۔ اب وہ کام کاج کے لئے شہروں کی طرف رُخ کرنے پر مجبور ہیں۔ اس طرح گاؤں خالی ہو رہے ہیں اور شہر بھرتے اور پھیلتے جا رہے ہیں۔ اس سے گاؤں کو بھی نقصان پہنچ رہا ہے، شہروں کو بھی۔ گاؤں میں تو بے کاری تھی ہی، شہروں میں بھی بیکاری بڑھ رہی ہے۔ شہروں میں بے کاروں کی فوج چنگڑ خانوں میں رہنے پر مجبور ہے۔ ایک طرف محلات بن گئے ہیں تو دوسری طرف جھگیاں بھی بڑھ گئی ہیں۔ اس طرح شہری اور بلدیاتی مسائل اور مفاسد پیدا ہو گئے ہیں اور لوگوں کی عام پریشانی کا باعث بن رہے ہیں۔ جو معاشی ترقی ہوئی ہے وہ چند شہروں تک محدود ہے۔ پھر وہ غیر ملکی امداد کی شرمندۂ احسان ہے۔ اس صنعتی پیداوار سے عوام الناس کا بھلا نہیں ہوتا کیونکہ اسے "امداد" کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے برآمد کرنا پڑتا ہے۔ غیر ملکی امداد کی سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ اس کا پھل غیر ملکی ہی کھا جاتے ہیں اور امداد لینے والے مجبور ہوتے ہیں کہ یہ پھل انہیں کھلائیں اور خود اس سے محروم رہیں۔ اور باتوں کے علاوہ غیر ملکی اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ صنعتی ترقی کا نتیجہ اس لئے ظاہر نہیں ہوتا کہ آبادی زیادہ تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ وہ اس کا حل خاندانی منصوبہ بندی بتاتے ہیں اور یوں امداد کی زنجیر کی ایک اور کڑی مہیا کر دیتے ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو اصل مسئلہ آبادی کی روک تھام کا نہیں، افرادی قوت کے بہتر استعمال کا ہے۔ اب یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ مغرب کا نظام چند افراد کی قوت استعمال کر کے اکثریت کی قوت کو دبائے رکھنے کا موجب ہوتا ہے۔ انفرادی قوت کے صحیح استعمال کا راز عوامی چین نے پا لیا ہے۔ چنانچہ وہ اب فخر سے کہتا ہے کہ اس کی آبادی ستر کروڑ ہے۔ کبھی اسکی غربت اور پسماندگی کی وجہ

کثرت آبادی بتائی جاتی تھی۔ آج یہی اس کی قوت اور ترقی کا راز سمجھا جاتا ہے۔

ترکی پر یہ راز کھلتا جا رہا ہے کہ ان کے مصاحب کا معاندانہ مغرب کے نام نہاد جمہوری نظام میں ہے نہ سرمایہ دارانہ معیشت میں۔ انہیں اپنے آپ پر تکیہ کرنا اور اپنے افرادی اور مادی وسائل کو بروئے کار لانا ہوگا۔ ترکی میں عنقریب انتخابات ہو رہے ہیں۔ ان کے لئے کم و بیش نصف درجن سیاسی جماعتیں سرگرم کار ہیں۔ عزائم اور مقاصد میں اختلاف کے باوجود سب معاشی خوشحالی اور معاشرتی انصاف کی باتیں کر رہی ہیں۔ بعض غیر ملکی اڈوں کی شدت سے مخالفت کر رہی ہیں۔ معاشی خوشحالی اور معاشرتی انصاف سرفہرست ملحوظات ہو گئے ہیں۔ کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام نے طرح طرح کی ناہمواریاں پیدا کر دی ہیں۔ غربت عام اور شدید ہو گئی ہے اور قومی صلاحیت قومی تعمیر و ترقی کے لئے استعمال نہیں ہو رہی۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ترکی نیا راستہ اختیار کرنے پر آگیا ہے۔ وہ دوراہے پر ہے۔ ابھی اسے بہت جدوجہد کرنی ہوگی۔ جرأت مندی اور پامردی سے ہی وہ اپنی منزل تک پہنچ سکے گا۔ مغربی طرز کے انتخاب اس منزل تک پہنچنے کا راستہ نہیں تاہم ان کی مدد سے وہ مسائل ابھر کر سامنے آتے جا رہے ہیں جنہیں توجہ کے قابل نہیں سمجھا گیا۔ اصل مسئلہ عوام کو اپنے آپ میں لانے اور ان پر زندگی کی راہیں کھولنے کا ہے۔ یہ مسئلہ مغربی انتخابات سے کہیں حل نہیں ہو سکا کیونکہ ان کے ذریعے اختیارات مفاد پرست طبقے میں محدود ہو جاتے ہیں اور حکومت بلاواسطہ نہیں تو بالواسطہ ان کے مفاد کی حفاظت کرتی ہے۔ اس طبقے کے علاوہ کسی کو فائدہ پہنچے تو وہ ضمنی ہوتا ہے، مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ لیکن جہاں یہ آثار دکھائی دینے لگے ہیں کہ حقیقی مسائل قومی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرائیں اور ان کے حل کی امید پیدا ہو، وہاں یہ کوشش بھی شروع ہو گئی ہے کہ ان آثار کو بائیں بازو کے اعمال نامہ میں شامل کر کے ان کی مذمت کی جائے اور مفاد پرست طبقے کے مفاد کے تحفظ پر ہی توجہ مرکوز رکھی جائے۔ ترکی میں ایک تشدد پسند گروہ پیدا ہو گیا ہے جس کا تعلق دائیں بازو سے ہے اور جس کا کام ان طلبا کا راستہ روکنا ہے جو آئے دن امریکہ کے خلاف مظاہرے کرتے رہتے ہیں۔ اس گروہ نے رضاکاروں کی ایک تربیت یافتہ جماعت تیار کر لی ہے اور اس جماعت نے کئی جگہ طلبا کے خلاف تشدد سے کام لیا ہے۔

یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ یہ گروہ کس کے اشارے پر معرضِ وجود میں آیا ہے اور کس کی مقصد براری کے لئے سرگرم کار ہے۔ مشاہدہ یہی ہے کہ نوآزاد ممالک میں دائیں بازو کے افراد ہی کو منتخب کر کے اپنی مطلب براری کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ افراد عوامی مسائل کا نام لینے والوں کو بے دریغ

سے بایاں بازو لہذا گردن زدنی قرار دے دیتے ہیں۔ وہ خود غیر ملکی کارندے ہوتے ہیں، لیکن غیر ملکی کارندوں کے خلاف کام کرنے کا دم بھرتے ہیں۔ ان میں ایک خاص قسم کا مذہبی طبقہ پیش پیش ہوتا ہے جو ہر "بدعت" کو "ضلالت" کہتا ہے اور اس کے لئے جہنم سے ادھر کوئی اور ٹھکانا تجویز نہیں کرتا۔ ترکی میں ایسے طبقے کا وجود ناقابلِ فہم نہیں۔ یہ دورِ سلطنت کے آثارِ قدیمہ ہیں۔ سلطنت کے آخری دور میں ترکی میں ملاگردی تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ نوجوان ترکوں کا یورپ کی طرف دیکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ملاکی رجعت پسندی سے ازحد نالاں تھے۔ یہ ذہنیت ختم ہوتے ہوتے ہوگی لیکن خودبخود نہیں، ختم کرنے سے ہوگی۔ ترکی اس قدیم و جدید کی کشمکش کے فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ اس کشمکش سے نکلنے کا راستہ، صحیح قرآنی نظام کے قیام کے سوا کوئی نہیں۔ یہی نظام ان الٰہیی قوتوں کو ختم کرے گا جو انسانیت کا راستہ روکے کھڑی ہیں۔

ادارہ طلوع اسلام کی حیات افروز پیشکش

جہاد

پرویز

جہاد کیا ہے؟ ——— جہاد اور جنگ میں کیا فرق ہے؟

مومن اور مجاہد کس طرح مرادف الفاظ ہیں؟ - قرآن کی رو سے قوانین جنگ کیا ہیں؟

اسلامی لڑائیوں کے متعلق معترضین کے اعتراضات اور ان کے مدلل جواب

ایک مختصر لیکن جامع تصنیف ——— بصیرت افروز حیات آموز

قیمت صرف • دو روپے فی جلد

ناظم - ادارہ طلوع اسلام - ۲۵ - بی - گلبرگ لاہور